جلد ۸۹ اپریل سنہ ۱۹۷۸ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

SCAN

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۹ | اپریل ۱۹۷۸ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

فون نمبر —— ۴۱۱۰۱۶ —— ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تاریخ درسگاہِ حکمت اسی لیے ہے کہ وہ آئینہ دارِ عبرت ہے!

پوری کائنات خدا کی سلطنت ہے، اور جس طرح اس کے سنن و نوامیس اس سلطنت کے جمادی، نباتی حیوانی موجودات پر حاوی ہیں، اسی طرح انسانی زندگی بھی خواہ وہ فرد کی ہو یا معاشرے کی، اسی کی تقدیرات اور اسی کے ضوابط میں جکڑی ہوئی ہے۔

ان بے لاگ قوانین کے تحت کوئی جامد اور کمزور قوم یکایک سر ابھارتی ہے اور دوسری طرف کسی طنطنہ دار قوم کا حال ویسا ہو جاتا ہے جیسے کوئی قصرِ رفیع الشان کھنڈروں میں بدل جائے۔ کوئی تہذیب عروج پر آتی ہے، اور کوئی پہلے سے تسلط یافتہ تہذیب جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتی ہے۔ کوئی شخص بوریا سے اٹھتا ہے اور تخت نشین ہو جاتا ہے اور کسی دوسرے کے سر سے قدرت تاج نوچتی ہے تو سر بھی اس کے سامنے زمین پر آ گرتا ہے۔ پوری تاریخ عظمتوں کا ایک قبرستان ہے۔ یہاں کبھی فرعون بھی تھا جس نے کہا تھا انا ربکم الاعلیٰ۔ یہاں نمرود بھی ہو گذرا ہے جس نے شانِ استکبار سے کہا تھا: انا احیی و امیت۔ یہاں چنگیز و ہلاکو بھی تلواریں لہرا چکے ہیں، جنہوں نے شہروں کو مقتل بنا دیا تھا، خون کے دریا بہائے، علم کے چراغ گل کیے اور عصمتوں کے گلشن تاراج کیے۔ یہاں کبھی ہٹلر کا مکہ ہوا میں لہراتا تھا اور مسولینی کی صیادوں جیسی نگاہیں دل و جگر سے گذر جایا کرتی تھیں۔ خود ہماری تاریخ میں یزید، شمر، حجاج بن یوسف اور ابن ہبیرہ جیسی خونخوار ہستیاں بھی گذری ہیں۔ پھر قریب کے دور میں دیکھیں تو مصطفےٰ کمال اور ناصر کا ڈنکا بجتا ہم نے دیکھا، مگر وہ جب اپنے مخالفِ دین ظالمانہ اعمال کی زد میں آئے تو رنگ کچھ اور ہو گیا۔ سرزمین پاکستان کیسے فراموش کر سکتی ہے غلام محمد اور سکندر مرزا اور صدر ایوب اور صدر یحییٰ کے ادوار کو

جب کہ ان لوگوں کے تخت ہمارے سروں پر بچھے تھے اور گردن ہلانا اور دم مارنا ممکن نہ تھا - لیکن انہیں اعزاز و اکرام کے اسٹیج سے سنن الٰہیہ نے دھکیل کر اس طرح پیچھے گرا دیا ہے کہ کوئی اُدھر مڑ کر دیکھتا بھی نہیں۔

شروع سے اب تک اسی طرح ہوتا آیا ہے، مگر ایسے لوگ کم نکلے جو تاریخ کے پچھلے واقعات سے عبرت کا درس لے سکتے۔ اور اس دُنیوی زندگی میں اقتدار کی آزمائش سے ہمیشہ کے لیے سُرخرو ہو کر نکلتے۔ اقتدار سب سے بڑا اعزاز اور ذریعۂ شہرت بھی ہے، اور اقتدار ہی سب سے بڑا سامانِ ذلت بھی۔ خدا کے رسولؐ نے کیا ہی صحیح فرمایا کہ اقتدار اللہ تعالیٰ کا ایک سایہ ہے اور جس کے حصے میں یہ آئے، اُس نے اگر اس کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی ذلت سے دوچار کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں اقتدار خدا کی طرف سے ایک گراں بہا امانت ہے۔ اور جو شخص اقتدار کی قوت کو استعمال کرنے میں خیانت کرتا ہے، اس کے اصل مالک کی مرضی سے بغاوت کر کے اُسے حصولِ مفاد اور دوسروں پر ظلم کرنے کا ذریعہ بناتا ہے تو وہ گویا اللہ کی معزز امانت کی توہین کرتا ہے۔ امانتِ اقتدار کی توہین کرنے والوں کو جس اُخروی انجام سے دوچار ہونا ہے وہ تو پیش آئے گا ہی، بالعموم اس دنیا میں ہی اللہ کا غضب و انتقام ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتا ہے۔

ہمارے درمیان ایک شخص اُٹھا اور اُس نے کہا کہ "میں پاکستان کے سب حکمرانوں سے زیادہ دیر تک حکومت کروں گا"۔ اس نے متعدد بار سیاسی یا صحافیانہ دائروں میں اختلاف کرنے والوں کو دھمکایا کہ میں "فکس اَپ کر دوں گا"، یہاں تک کہ کچھ دنوں تک کے لیے یہ الفاظ زدِ عام ہو گئے۔ اُس نے کئی معاملوں میں کہا کہ یوں ہوگا، "ورنہ پھر دما دم مست قلندر!" انتخابات ۱۹۷۰ء کے بعد جب قومی اسمبلی کے اوّلین اجلاس کا انعقاد مشرقی پاکستان میں کرنے کا اعلان ہوا تو اُس نے کہا کہ مغربی پاکستان سے اگر کوئی شخص اس میں شرکت کے لیے جائے گا تو اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اور اس نے انتخابات مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد تناؤ کے ساتھ کہا کہ انتخابات دوبارہ نہیں کرائے جا سکتے۔ انتخابی دھاندلی کے خلاف عوام کے احتجاجی مظاہروں کو روکنے کے لیے جب گولیاں برس رہی تھیں تو اس نے کہا کہ "میری کرسی بڑی مضبوط ہے"۔

لیکن ۵ رجولائی کو وہ مضبوط کرسی اُلٹ گئی اور "چیئرمین" صاحب قلعے کے سے حفاظتی انتظامات میں

گھر سے ہوئے قصرِ وزارت سے نکل کر خار زار حراست میں جا پہنچے یا اللہ، برحق ہے کہ تعز من تشاء و تذل من تشاء!

یاد کیجیے اس شخص کی چالاکیاں، اس کی جبر کیشیاں، اس کی تیزیاں اور طراریاں، اس کے کرائے ہوئے قتل اور اغوا، اس کا قائم کردہ غیر قانونی جیل دولائی کیمپ، اس کے سجاتے ہوئے بنگلے اور مہمان خانے اس کے عشرت کدوں میں خم لنڈھانے اور عصمتیں برباد کرنے کے انتظامات، قومی خزانے کا بے رحمانہ استعمال، اقتصادیات کی بربادی کے اقدامات، عہدوں کا اپنے حامیوں اور خوشامدیوں میں بٹوارہ، لائسنسوں پرمٹوں اور راشن ڈپوؤں کی سیاسی بنیادوں پر تقسیم، بلوچستان سے عورتوں کا پردہ ختم کرانے کی تحریک کا آغاز، ذرائع ابلاغ کا اپنے اور اپنی پارٹی کے حق میں پروپیگنڈا کرانے کا بھرپور استعمال، انتخابات ۱۹۷۷ء میں سرکاری ملازمین کے تعاون سے دنیا بھر کی سب سے بڑی دھاندلی، دھاندلی کے خلاف اٹھنے والے ایجی ٹیشن میں سیاسی لیڈروں اور ورکروں، ججوں اور وکیلوں، علماء اور طلباء اور پردہ دار خواتین کے خلاف اندھا دھند لاٹھیوں، گیس اور گولیوں کی بوچھاڑیں، شاہی قلعے اور سی۔آئی۔اے اور دفتروں اور تھانوں میں گرفتار لوگوں پر وحشیانہ تشدد، عدالتوں کو درکنار رکھ کر ٹربیونلوں کے ذریعے سیاست کاروں اور صحافیوں کو سزا دہی، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اپنی بہادر فوج کو مشرقی پاکستان میں ذلت آمیز شکست سے دوچار کرانے اور نوّے ہزار افراد کو بھارت کا قیدی بنوانے کا کارنامہ۔ پھر انہی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے شملہ معاہدے کا شاخسانہ، مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنوانے میں مؤثر پارٹ، فوج کو مجبور کر کے بلوچستان پر چڑھائی کرانا، جرائم پیشہ اور غنڈہ افراد کو سیاسی میدان میں لا کر معاشرے کے شرفا کو گھٹیا عناصر کے سامنے بے بس کر دینا، تعلیم یافتہ طبقے کے مقابلے میں ان پڑھ عوام کو روٹی کپڑے مکان کے نعرے سے مست کر کے صف آرا کرنا، قوم کے نونہالوں کو سڑکوں پہ ننگا کر کے پٹوانا، اسلامی سوشلزم کے لایعنی سلوگن کو فروغ دے کر قوم میں فکری بحران پیدا کرنا، کرائے کے سامعین کو بلا کر جلسوں جلوسوں کی رونق بڑھانا ـــــ جس شخص کی داستانِ قیادت کے یہ ابواب ہوں، قدرت اسے آخر کہاں تک ڈھیل دیتی۔

کیا ہی ایکٹنگ کی شان تھی اس شخص کی اس دن جب ایک بیرونی دورے سے (غالباً افغانستان یا ایران سے) واپس آنے پر اسے بتایا گیا کہ ڈاکٹر نذیر کو قتل کر دیا گیا ہے تو یہ شخص قومی اسمبلی کے لیے جماعت اسلامی کی منتخب شدہ اس نمایاں شخصیت کے متعلق نادان بن کر پوچھتا ہے: 'WHO WAS THIS GENTLEMAN'

یعنی یہ بھلا آدمی کون تھا؟ اُس سے یہ نہ ہو سکا کہ اس اطلاع کو سن کر یہ کہتا کہ بڑا افسوسناک واقعہ ہے، یا کہتا کہ اس کی فوری تحقیقات ہونی چاہیے اور قاتلوں کو پکڑ کر سزا دلوانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ بھٹو صاحب سے اگر کسی مقتول کی خبر بیان کی جا رہی تھی تو اُس کی کوئی اہمیت تھی۔ ان کی مشکل شاید یہ رہی ہوگی کہ اپنے بے شمار قتیلانِ ناز میں سے کس کس کو جانیں ——— ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، مولوی شمس الدین، عبدالصمد اچکزئی، ضامن علی، نواب محمد احمد خاں ——— بیچارے یہی پوچھ کر رہ گئے کہ ؎

یہ کون تھا؟ کس کا خون بہا؟

کتنی ہی شہ رگوں کا خون اور کتنی ہی آنکھوں کے آنسو اور کتنے ہی ہونٹوں کی آہیں اور کتنے ہی دلوں کی بددعائیں بھٹو صاحب کے پیمانۂ مقدر میں بھرتی چلی گئیں، یہاں تک کہ پیمانہ چھلک گیا۔ یہ وقت جب آجاتا ہے تو پھر قاعدہ یہی ہے کہ لا یستاخرون منه ساعةً ولا یستقدمون ۔ رات کو نشۂ اقتدار میں حسبِ معمول شیر ژیاں بنے، صبح ہوئی تو نشہ ہرن ہو گیا اور شیر قالین بھی نہ رہے، کیونکہ قالین ہی باقی نہ تھا ؎

جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا

میں نے گردشِ ایام کا یہ شعبدہ دیکھا تو ایک لحظے کے لیے لحظۂ فکر یہ مجھ پہ طاری ہو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ ایک شخص کی ہفت رنگ ذہانت، اس کی ساحری، اس کی بازی گری، اس کے ملکی اور بین الاقوامی تعلقات، انگریزی، اُردو اور سندھی میں طلاقتِ لسانی، اقتدار کے محل میں رہ کر بڑے درجے کی سیاست کاری کے براہ راست تجربات و مشاہدات، ۱۹۶۵ء سے تخت تک پہنچنے کے دُور رس منصوبوں پہ کام کرتے ہوئے طرح طرح کے جوڑ توڑ، اُوپر محلاتی سازشں میں حصہ داری اور نیچے عوام میں انتخابی معرکہ آرائی ——— اس ساری تگ و تاز کا حاصل بس یہی چار چھ برس کی فرماں روائی، اور اس کے بعد طرح طرح کے سیاسی و اخلاقی، اور ذاتی و قومی جرائم کے انبار تلے دب کر رہ جانا! آخر ایسا کیوں ہوا؟

اعماقِ دل سے جواب ملا کہ بندہ ہوتے ہوئے خدا سے بے نیازی، اس کے بندوں کی بہت بڑی خدمت کی ذمہ داری کندھوں پہ لینے کے بعد اُلٹا عوام کو فسطائیت کی چکی میں پیس دینا، لوگوں کے دلوں کو ہاتھ میں لینے کے بجائے یا تو انہیں مغالطوں اور خوش فہمیوں میں ڈال کر ساتھ گھسیٹنا، یا پھر ان کو جبریت اور تذلیل و تحقیر کا نشانہ بنانا، جھوٹ کی ریتلی بنیادوں پر پروپیگنڈے کے حفاظتی قلعے کھڑے کرنا، اسلام کا نام لے لے کر اسلام کو جراحتیں پہنچانا اور احیائے اسلام کا راستہ روکنے کے لیے ایسی جزوی، سرسری اور نمائشی

کارروائیاں کرنا جن سے عوام کے دل بہلے رہیں اور برادر مسلم ممالک اچھی توقعات وابستہ کریں، اپنی تمام سرگرمیوں میں تضادات بھر دینا، یہ تھے وہ وجوہ جن سے بیس سال کی تیاریاں کر کے حکمرانی پانے والا ایک شخص مدتِ تیاری کے ایک چوتھائی حصّے میں محل سے دھکیل کر باہر کر دیا گیا، اور باہر بھی اب قوم اس کے لیے پھولوں کے ہار لیے نہیں کھڑی ہے کہ اس کی زرّیں خدمات کی تحسین تو باقی ہے۔

چند اہل مفاد اور نافہم عقیدت مندوں کا قصیدے پڑھنا اور چیز ہے، اور قوم کے مجموعی مزاج کا ردّ عمل اور چیز۔

مگر جس طرح اقتدار پر آکر آدمی بر خود غلط ہونے کی وجہ سے خود ہی اپنی محرومیٔ اقتدار کے سامان کرتا ہے، اسی طرح اقتدار سے الگ ہونے پر وہ ایک اور طرح کے مغالطے میں پڑ کر یہ سمجھتا ہے کہ جو بازی ہر گئی ہے اُسے وہ دوبارہ جیت لے گا۔ اور اس مغالطے کے تحت جو مساعی وہ کرتا ہے وہ اسے اور خراب کرتی ہے۔ بلکہ ایک مفروضہ کے طور پر آج اگر بھٹو صاحب کو پھر تخت نشین کر دیا جائے تو وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر ظلم اور جھوٹ سے کام لیں گے اور پہلے سے زیادہ بڑی رسوائی کے ساتھ برطرف کیے جائیں گے۔ کاش کہ وہ اپنی غلطیوں اور حالات کی ناسازگاریوں اور قومی رجحانات کی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں۔

انسانوں کی اکثریت کی مشکل یہی ہے کہ وہ نہ تاریخ سے سبق لیتے ہیں، نہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں، اور نہ بدلے ہوئے حالات کے تیور پہچانتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی سوراخ سے دس دس بار ڈسے جاتے ہیں۔

بھٹو صاحب یا دوسرے لوگ جو کچھ بھی سوچتے ہوں، میری سوچ و بچار کا ماحصل یہی ہے کہ میں خدائے قیوم و قدوس کے سامنے سرافگندہ ہو کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اے اللہ تمام کائنات تیری سلطنت ہے، تمام انسان تیرے بندے ہیں۔ تمام افراد و اقوام پر تیرا بے لاگ قانون نافذ ہے، تو چاہے تو ریگزاروں میں لالہ و گل کھلا دے اور چاہے تو عالیشان آبادیوں کا خاک اُڑا دے۔ تیرا اشارہ ہو تو کوئی گدائے بے نوا سریر آرائے سلطنت ہو سکتا ہے اور تو چاہے تو کسی آقائے ولی نعمت کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دے یا پھانسی کے تختے پر پہنچا دے۔ اے مالک الملک! مجھے بھٹو صاحب سے کوئی ذاتی نفرت نہیں ہے، کسی شخصی معاملے میں میں اپنے اندر ان کے لیے کوئی خواہش انتقام نہیں رکھتا، کوئی اندھا جذبہ مجھ میں ایسا نہیں ہے کہ ان کو مصیبت میں دیکھ کر مجھے تفریح حاصل ہو۔ میرے لیے اُن کی غلطیاں بھی باعثِ رنج

مفیں، اور اب ان کے حق میں غلطیوں کے جو نتائج نکل رہے ہیں، ان پر بھی ویسا ہی ملال ہے، جیسا کسی زہر کھا لینے والے کی کشمکشِ موت و حیات کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ البتہ انہوں نے پاکستان جیسی پیاری مملکت کے اندر بسنے والی قوم کو سیاسی، اخلاقی، معاشی، ثقافتی اور فکری لحاظ سے جس بڑی طرح تباہ کیا ہے اس کا تلخ احساس کسی بھی محبِ دین اور خادمِ ملت فرد کی طرح میری روح سے کبھی الگ نہیں ہوتا۔ قوم نے غلام محمد، سکندر مرزا، صدر ایوب اور محمد یحییٰ کے ادوار کے مقابلے میں بھٹو دور میں کئی گنا زیادہ چرکے کھائے ہیں۔ قدرت بھٹو صاحب کے حساب کا کچھ حصہ اس دنیا میں لے لے گی یا نہ لے گی، یہ تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن آخرت میں اُن کو ذرے ذرے، لفظ لفظ، قدم قدم اور پیسے پیسے کا حساب احکم الحاکمین کو دینا ہوگا۔ جبکہ ہزارہا فریادی اُن کو گھیرے ہوئے ہوں گے۔ اور بعض مقدموں میں تو خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدعی ہوں گے۔ ع

بچتے نہیں، مواخذۂ روزِ حشر سے

وہاں موصوف کے لیے حساب پورا کر دکھانا بھی محال، اور تلافیٔ مافات بھی ناممکن! ـــ باقی انجام صرف خدا ہی جانتا ہے۔

موصوف کو ایک اخلاقی جرم میں ہائی کورٹ سے جو سزا ملی ہے، اس کے خلاف ایک طرف ملک میں مصنوعی طور پر تخریب کاری کا طوفان اٹھایا گیا (کیونکہ پہلا دن خاموشی سے گزرا تھا) اور دوسری طرف احتجاج اور درخواستِ رحم کی ایسی شکلیں سامنے آئیں جن میں قانون کی عملداری پر عدم اعتماد اور عدلیہ کی توہین کے پہلو نکلتے تھے۔ رہیں باہر کی رحم کی اپیلیں تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے جو سرکردہ اور غیر نمایاں حضرات ملک سے باہر چلے گئے ہیں وہ جا بجا سارے معاملے کو اپنے رنگ میں پیش کر کے ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف ہمارے ہاں سے یہ اہتمام بر وقت نہ ہو سکا کہ موعودہ قرطاسِ ابیض کے ذریعے بھٹو صاحب کا پورا کردار دُنیا کے سامنے واضح کر دیا جاتا تاکہ وہ ان کے خادمِ قوم اور حامیٔ دینِ متین اور علمبردارِ جمہوریت ہونے کی حقیقت کو جان لیتے۔ نیز وہ سمجھ جاتے کہ بات یہ نہیں کہ ایک ملک کے سابق وزیر اعظم سے کوئی اکا دکا جرم سرزد ہو گیا، بلکہ حقیقت یوں ہے کہ ایک ہر جہتی مجرم تھا جو اتفاق سے ملک کے مسندِ اقتدار پر قابض ہو گیا۔

(۲)

آج مملکتِ پاکستان جس مرحلے سے گذر رہی ہے، وہ ترکِ اختلافات کا مرحلہ ہے۔ تاریخ میں کبھی کبھی اسی طرح کے مرحلے سامنے آتے ہیں، جب کہ تمام مفاد الگ رکھ دینے ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے تشخص کے میناروں کی چنائی کا کام روک دینا پڑتا ہے اور وزارتوں، انتخابی نشستوں اور اختیارات بلا شرکتِ غیرے کے خواب فراموش کر دیے جاتے ہیں۔

خوش قسمت ہوتی ہے وہ قوم جس کے فکری، دینی اور سیاسی قائدین تاریخ کے بدلتے موسموں کو پہچانتے ہیں اور فضا کا رنگ دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ طوفانِ سموم آنے والا ہے یا ہوا کی ایک اشاراتی خوشبو سے سمجھ لیتے ہیں کہ بارانِ رحمت کی آمد آمد ہے، یا پرندوں کی غیر معمولی آوازوں اور جانوروں کی مضطربانہ حرکات سے نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ زلزلہ درپیش ہے۔ اس طرح کے اہلِ بصیرت جہاں ہوں وہاں وہ بڑی آسانی سے حالات کے اُن مرحلوں کو جان لیتے ہیں جو ترکِ تشخص اور ایثارِ مفاد کے مرحلے ہوتے ہیں اور جبکہ خدمتِ ملک و ملت کی واحد راہ اتحاد اور تعاون کی راہ ہوتی ہے۔ اور اگر اس کینڈے کے لوگ ہی کسی ملک میں نہ ملیں تو پھر ہر قسم کے بحران نمودار ہو سکتے ہیں اور دریائے وقت کا کوئی بھی جوار بھاٹا پورے سفینے کو ڈبو سکتا ہے۔

یہاں کچھ عجیب صورت حالات ہے۔ ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو پاک فوج نے ہمیں پوری تاریخ پاکستان کے سب سے زیادہ تاریک دَورِ قاہری و ساحری سے نجات دلائی[1] ملک کے اکابر نے (باقی برصفحہ ۴۵)

---

[1] آج بعض سیاسی دانشور بڑے جمہوریت نواز بن کر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ہم فلاں صورت اس لیے اختیار نہیں کر سکتے کہ یہ تقاضائے جمہوریت کے خلاف ہے۔ اگر تقاضائے جمہوریت ہی کو اہمیت دی جاتی تو پھر کون سے جمہوری طریق سے آپ گذشتہ لاجمہوری دَور سے نجات پاتے۔ غالباً طرزِ فکر یہ ہے کہ جب کبھی غیر جمہوری طریق سے کام لینا ضروری ہو جائے تب تو کوئی اور قوت آ کر اس کو ہمارے لیے سرانجام دے دے۔ اور جب وہ سرانجام دے لے تو آپ اس کے قریب سے یہ کہہ کر بھاگیں کہ ہم تو جمہوری لوگ ہیں۔ اور ان جمہوریوں میں وہ بھی ہیں جن کی نہ جماعت سازی اور رکن سازی کسی قرینے قاعدے سے ہوتی ہے۔ نہ لیڈر اور دیگر عہدہ داروں کے باضابطہ جمہوری (باقی برصفحہ ۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ حکومت

ابوالاعلیٰ مودودی

[۹ — ۱۰ مارچ کو ریڈیو پاکستان نے مجھ سے ایک بہت مفصل انٹرویو لیا تھا۔ وہ گفتگو چونکہ ساری زبانی ہوئی تھی اس لیے مجھے اس کو تحریری شکل میں مرتب کرتے ہوئے ضروری تغیرات کرنے پڑے ہیں۔ اس لیے اس کے لفظ لفظ کو ریڈیو کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا]

ابوالاعلیٰ

نمائندہ ریڈیو۔ جناب قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

ریڈیو پاکستان کے لیے یہ لمحہ بہت مبارک ہے کہ ریڈیو کا یہ نمائندہ جناب والا کی خدمت میں حاضر ہے۔ التدعا یہ ہے کہ خداداد مملکت پاکستان کے مسلمان تیس سال کی بے راہ روی کے بعد اللہ کی رسی کو پکڑنا چاہتے ہیں اور اللہ کے فضل سے آج اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔ مولانا محترم۔ رہنما تو اور بھی ہیں لیکن ہماری پریشان خیالی کا عالم یہ ہے کہ ؎

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آج صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے ہم ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے طالب ہیں تاکہ ہماری دنیا اور دین دونوں سنور سکیں۔ مولانا محترم۔ پہلی گذارش تو یہ ہے کہ آپ ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز حکومت کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کے دور میں ہم اس طریق حکومت کو کس طرح اپنا سکتے ہیں۔ آج کے دور میں ایک ترقی یافتہ مملکت کے حسن و قبح کو پرکھنے کے لیے حسب ذیل چار پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱- اقتدار اعلیٰ کس کو حاصل ہے۔

۲ - مقننہ کی نوعیت و اختیارات و حدود کیا ہیں ؟

۳ - عدلیہ کس حد تک آزاد اور بے لاگ ہے ؟

۴ - انتظامیہ کی حدود، اختیارات اور خصوصیات کیا ہیں ؟

اس نقطۂ نگاہ سے آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک پر روشنی ڈالیں۔ ہمیں آج کے لیے، آنے والے کل کے لیے بلکہ ہمیشہ کے لیے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور ارشادات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک خزینے کی تلاش ہے۔ میرے ہمراہ عبدالوحید خاں صاحب ہیں جو آپ سے ضمناً استفسارات فرمائیں گے۔ جناب والا میری پہلی گذارش تمام ہوتی ہے۔

جواب: - مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے مجھ کو یہ موقع دیا کہ میں ملک کے مسلمانوں کو عموماً اور ملک کے حکمرانوں کو خصوصاً یہ بتاؤں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام حکومت قائم فرمایا تھا اس کی بنیاد اور اس کی تشکیل کیا تھی۔

بنیادی طور پر جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی وہ یہ تھی کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نہیں ہے۔ زمین خدا کی ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی اور ہر وہ چیز جس پر ہم زندگی بسر کرتے ہیں، سب کچھ خدا کا ہے۔ یہ جسم جو ہمیں حاصل ہے اور اس کے اندر جو طاقتیں ہیں اور اس کے جو اعضا ہیں، سب خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ ہم خود اقتدارِ اعلیٰ کا دعویٰ کریں، یا کسی ایسے شخص یا گروہ، یا ادارے کا دعویٰ قبول کریں جو اقتدارِ اعلیٰ کا مدعی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولین بات جو انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش فرمائی اور جس پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دی، وہ یہی تھی کہ ملک بھی اللہ تعالیٰ کا ہے، حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کے سوا کسی کو انسان کے لیے قانون بنانے کا حق نہیں ہے۔

دوسری بات جو اسی طرح بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو براہ راست قانون نہیں دیتا بلکہ اپنے رسولوں کے ذریعے سے دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے منتخب کیے ہوئے حکمران نہیں تھے۔ نہ خود بنے ہوئے حکمران تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس منصب پر مقرر فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کو تعلیم بھی دیں، ان کی تربیت بھی کریں،

اُن کے ذہن و فکر اور اخلاق کو بھی ٹھیک کریں، اُن کو اللہ تعالیٰ کے احکام بھی پہنچائیں، اور جو لوگ ان احکام کو قبول کر کے اُن کے برحق ہونے پر ایمان لائے ہوں ان کے ذریعہ سے احکامِ الٰہی کو نافذ فرمائیں۔

تیسری اہم چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو بتائی اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی وہ آخرت کا تصور ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ نہ سمجھے اور اس کو یہ یقین نہ ہو کہ ایک دن اُسے مر کر اپنے خدا کے سامنے جانا ہے اور اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے، تو وہ نہ اسلام کے راستے پر چل سکتا ہے، نہ حقیقت میں صحیح انسان بن سکتا ہے۔

اِن عقائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے تیرہ سال مکۂ معظمہ میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور جن لوگوں نے ان کو مان لیا ان کو آپ نے ایک جماعت، ایک اُمت کی شکل میں منظم کیا۔

حضورؐ کے زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری تین سال ایسے تھے جن میں مدینۂ منورہ کے باشندوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ایمان لے آئی اور اس نے آپ کو دعوت دی کہ آپ اُن کے شہر میں سب مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بہت صحیح بات کہی ہے کہ "مدینے کو قرآن نے فتح کیا ہے"۔ یعنی کوئی تلوار نہیں تھی، کوئی جابرانہ طاقت نہیں تھی جس سے مدینے کے لوگ اسلام کے پیرو بنے ہوں، بلکہ قرآن مجید جب اُن کو پہنچا اور مکۂ معظمہ میں قرآن کی جو سورتیں نازل ہوئی تھیں وہ اُن کے علم میں آئیں تو وہ نہ صرف یہ کہ سچے دل سے ایمان لے آئے بلکہ انھوں نے اپنی چھوٹی سی بستی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اہلِ ایمان کو تشریف لے آنے کی دعوت دے دی۔ یہ دعوت اِس بات کی نہ تھی کہ آپ اور مکے کے مسلمان اُن کے ہاں پناہ گزین ہوں۔ بلکہ اِس بات کی تھی کہ حضورؐ اُن کے معلّم، مربّی اور فرمانروا ہوں، مہاجرین و انصار ایک اُمتِ مسلمہ بن جائیں، اور مدینے میں وہ نظامِ زندگی قائم ہو جس پر یہ اُمت ایمان لائی ہے۔ اِس طرح جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے اسی روز اسلامی حکومت کی بنا پڑ گئی۔

اس حکومت کا اوّلین کام یہ تھا کہ لوگوں میں اسلام کا علم پھیلایا جائے۔ کیونکہ اسلام جہالت کا

نام نہیں علم کا نام ہے۔ حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں نے اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ لوگ دین کو سمجھیں اور سمجھ کر ایمان لائیں۔ جوں جوں یہ علم پھیلتا گیا اور لوگ اس کو جان کر مانتے گئے، اسلام کی طاقت بڑھتی چلی گئی اور اس کی بنیاد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

دوسرا عظیم کام جو آپ نے کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اخلاق درست کیے جائیں اور ایک ایسا اسلامی معاشرہ پیدا کیا جائے جس کی ہر چیز اخلاقِ صالحہ پر مبنی ہو۔ کوئی نظام حکومت خواہ کیسے ہی اعلیٰ مرتبے کا ہو، اور اس کے قوانین خواہ کتنے ہی بہتر ہوں، اگر اُس کی عمارت عمدہ اخلاق کی مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو، اگر اُس کے چلانے والے بلند سیرت و کردار کے مالک نہ ہوں، اور اگر وہ معاشرہ جس میں اُسے قائم کیا گیا ہو ایماندار اور خدا ترس نہ ہو تو وہ کبھی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اسی لیے حضورؐ نے ایمان کی دعوت اور علم دین کی اشاعت کے بعد سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا وہ تزکیۂ اخلاق تھا۔ آپ کے قائم کیے ہوئے نظام حکومت کی فطرت ہی یہ تقاضا کرتی تھی کہ لوگوں کے اخلاق ٹھیک اس نظام کے مزاج کے مطابق ہوں۔ اس صورت میں احکام کو نافذ کرنے کے لیے قوت استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جبر و قہر کے ساتھ زبردستی اطاعت کرانے اور لوگوں کو دبا کر فرمانبردار بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور فلاں چیز سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد لوگ خود بخود ان فرامین کی تعمیل کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں کوئی پولیس نہ تھی۔ کوئی جیل خانہ نہیں تھا۔ کوئی جاسوسی کا نظام نہیں تھا۔ اس بات کا تصور تک نہ کیا جاسکتا تھا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی حکم لوگوں کو پہنچے اور وہ اُس کی خلاف ورزی کریں۔

اس کے لیے امتناعِ شراب ہی کے معاملہ کو بطور مثال لے لیجیے۔ جس وقت مدینے کی بستی میں یہ اعلان ہوا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے اُسی وقت شراب کے مٹکے توڑ دیے گئے، اور پینے والوں میں سے جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رُک گیا۔ اس طرح کی پابندیٔ قانون کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کے برعکس امریکہ میں اربوں روپیہ اس کام پر صرف کیا گیا کہ لوگوں کو شراب کی برائی اور اُس کے نقصانات کا قائل کیا جائے۔ بہت بڑے پیمانے پر اُس کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا۔ اور رائے عامہ کی تائید سے امریکہ کے دستور میں ترمیم کر کے امتناعِ شراب کا قانون پاس کیا گیا۔ لیکن جس روز یہ قانون پاس ہوا اس کے دوسرے ہی روز سے پورے ملک میں اس کی خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ طرح طرح کی زہریلی شرابیں

پی جانے لگیں اور یہ وبا اس قدر خطرناک صورت اختیار کر گئی کہ آخر کار اس قانون کو منسوخ کرنا پڑا۔ اب ذرا مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے۔ ایک جگہ بس ایک حکم دیا جاتا ہے اور فوراً اُس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ دوسری جگہ بڑی تیاری کے بعد لوگوں کی مرضی سے قانون بنایا جاتا ہے اور لوگ اس کو توڑ ڈالتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ایک صالح نظامِ حکومت کی بنیاد ایمان اور اخلاق پر قائم ہوتی ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں وہاں آپ کاغذ پر خواہ کتنا ہی اچھا دستور اور قانون بنا لیجیے، زمین پر وہ کبھی نافذ نہیں ہو سکتا۔

سوال:- موجودہ زمانے کی مغربی جمہوریت کی جو چار خصوصیات ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ خصوصیات کس شکل میں تھیں؟

جواب:- جہاں تک اقتدارِ اعلیٰ کا تعلق ہے، میں بتا چکا ہوں کہ حضورؐ کی تعلیم کے مطابق یہ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ رہی نظامِ حکومت کی تین شعبوں میں تقسیم، یعنی مُنتظِمہ، مُقننہ اور عدلیہ، تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں نہ تھی۔ حضورؐ قانون دینے والے بھی تھے، جج بھی تھے اور حاکم بھی۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نبی کی حیثیت سے یہ تمام اختیارات آپ کی ایک ہی ذات میں جمع تھے۔

لیکن حضورؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملتا تھا اُس میں تو آپ لوگوں سے بے چون و چرا اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس میں کسی کے لیے کلام کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جس معاملہ میں اوپر سے کوئی حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا اُس میں آپ صحابہ سے خود بھی مشورہ فرماتے تھے، صحابہ کو بھی یہ حق دیتے تھے کہ وہ آپ کی رائے سے اختلاف کریں، اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنی رائے چھوڑ کر اُن کی رائے قبول فرمائی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر آپ نے ابتدا میں جس جگہ پڑاؤ کیا تھا اُس کے متعلق ایک صحابی نے اُٹھ کر پوچھا کہ یہ جگہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اختیار فرمائی ہے یا یہ آپ کی اپنی رائے ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، میں نے خود یہ جگہ تجویز کی ہے۔ اس پر اُنھوں نے عرض کیا کہ اس کے بجائے فلاں مقام جنگی حیثیت سے زیادہ موزوں ہے۔ اور آپ نے اُن کی رائے قبول فرما لی۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دو طرح کی تربیت دے رہے تھے۔ ایک اِس بات کی تربیت کہ جب خدا کی طرف سے کوئی حکم آئے تو اُس کی بے چون و چرا اطاعت کرو۔

دوسری تربیت اِس بات کی کہ جس معاملے میں خدا کا حکم نہ ہو اس میں اہل الرائے سے مشورہ بھی کیا جائے، لوگوں کو بحث کا کھلا حق بھی دیا جائے، حضورؐ کی اپنی رائے تک سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری رائے بھی پیش کی جاسکے اور مشورے کے بعد جو بات طے ہو اُس پر عمل کیا جائے۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے۔ جنگِ احزاب کے موقع پر جب حالات بہت نازک ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ دشمنوں کے چند قبائل، جن کی بڑی طاقت وہاں جمع تھی، ان کو مدینے کی پیداوار کا ایک حصہ پیش کر کے مخالفین کی جتھہ بندی سے انہیں الگ کر دیا جائے۔ انصار کے سرداروں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یہ معاملہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے حکم سے طے فرما رہے ہیں یا یہ آپ کا اپنا خیال ہے؟ حضورؐ نے فرمایا یہ میرا اپنا خیال ہے۔ میں تمہیں اِس خطرے سے نکالنا چاہتا ہوں جس میں تم پڑ گئے ہو۔ انھوں نے کہا، یا رسولؐ اللہ، جب ہم کافر تھے اُس زمانے میں بھی یہ قبائل ہم سے ایک حبہ تک نہ لے سکے تھے۔ اور اب تو ہم مسلمان ہیں۔ اب یہ ہم سے کوئی چیز کیسے لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اُسی وقت اُن کے کہنے کے مطابق یہ معاملہ ختم کر دیا گیا۔ اِس مثال سے بھی آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ حکومت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن معاملات میں اللہ کا حکم ہوتا تھا وہاں کوئی جمہوریت نہ تھی اور جن معاملات میں اُوپر کا حکم نہ ہوتا تھا اُن میں پوری جمہوریت تھی۔

اب عدلیہ کے مسئلے کو لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قاضی تھے۔ اس لیے عدلیہ بھی پوری طرح آپ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اِس معاملے میں آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ نہ صرف انصاف کیا جائے بلکہ لوگ یہ بھی دیکھ لیں کہ انصاف کیا جا رہا ہے۔ تمام مقدمات کی سماعت کُھلی عدالت میں ہوتی تھی۔ خفیہ سماعت کی کوئی نظیر آپ کے طریقِ عدل میں نہیں ملتی۔ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ایک صحابی نے مشرکینِ مکہ کے نام ایک خط لکھ دیا جس میں اُن کو مطلع کیا گیا تھا کہ تم پر حملہ ہونے والا ہے۔ وہ خط پکڑا گیا۔ اب یہ صریح جاسوسی کا معاملہ تھا۔ اِس زمانے کے لوگ کہیں گے کہ ایسا خطرناک معاملہ تو بند کمرے میں پیش ہونا چاہیے تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں اس کی کُھلی سماعت فرمائی۔ دوسرا اہم قاعدہ آپ کی عدالت کا یہ تھا کہ کسی مقدمے کا فیصلہ فریقین کی بات سُنے بغیر نہ کیا جائے اور کسی شخص کو صفائی کا پورا موقع دیے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے کسی بنیادی حق سے اُسے محروم نہ کیا جائے۔ حضورؐ نے مدینہ کے باہر جو قاضی مقرر فرمائے تھے ان کو بھی آپؐ کی ہدایت یہ

تھی کہ فریقین کی بات سُنے بغیر کسی معاملے کا فیصلہ نہ کریں۔ عدالت کے کام میں سفارش کا دروازہ آپؐ نے بڑی سختی کے ساتھ بند کر دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے ایک معزز خاندان کی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ اس کے خاندان نے کوشش کی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ حضرت اُسامہؓ بن زید سے، جو حضورؐ کو نہایت عزیز تھے، سفارش کرائی گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم حدود اللہ کے معاملے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں وہ اِسی لیے تباہ ہوئیں کہ اُن کے عام آدمی جب کوئی جرم کرتے تھے تو اُن کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی تھی، اور بڑے لوگ جب وہی جرم کرتے تھے تو اُن کے ساتھ رعایت برتی جاتی تھی۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس طرح آپؐ نے سفارش کا دروازہ ہی بند نہ کیا بلکہ یہ اصول بھی قائم فرما دیا کہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ یہ اُصول بھی آپؐ نے قائم فرمایا کہ کوئی شخص عدالت کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرلے تو اُس کا فائدہ وہ دُنیا ہی میں اُٹھا سکے گا۔ آخرت میں خدا کی پکڑ سے کوئی چیز اُسے نہ بچا سکے گی۔

اس کے بعد مقننہ کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اس میں چونکہ بنیادی طور پر قانون اللہ تعالیٰ کا تھا اور وہی قانون بنانے کا حق رکھتا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت قانون ساز کی نہ تھی بلکہ قانون کو نافذ کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے، اور لوگوں کو اُس کے مطابق عدل و انصاف کا نظام چلانے کی تربیت دینے والے کی تھی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کیا ہے اور پھر اس کی وہ تشریح فرمائی جو سنت میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں چوری کی سزا کا حکم بڑے مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس سے زائد کوئی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جس نے ہمیں بتایا کہ اس حکم پر عمل کن حالات میں ہوگا اور کن حالات میں نہ ہوگا۔ چوری کسے کہتے ہیں اور کسے نہیں کہتے۔ کس قسم کے اور کتنے مال کی چوری کے لیے یہ سزا ہے اور اِس پر عمل کس طرح ہوگا۔ اگر سنت کے ذریعے سے قرآن کے حکم کی یہ تشریح ہمیں نہ ملی ہوتی تو ہم اس حکم کی کبھی صحیح تعمیل نہ کرسکتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ خود قانون ساز نہیں تھے۔ بلکہ اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ تھا اور آپ اس کے مقرر کردہ سرکاری شارح تھے۔ اِس طرح جس چیز کو ہم اسلامی قانون کہتے ہیں وہ قرآن اور سنتِ رسولؐ کے مجموعے کا نام ہے۔

قانون نافذ کرنے کے معاملے میں جو نظام آپ نے قائم فرمایا تھا اس کے بڑے بڑے اصول یہ تھے کہ لوگوں کو جہاں تک ممکن ہو سزا سے بچاؤ۔ قاضی کا کسی قصور دار کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ بے قصور کو سزا دینے میں غلطی کرے۔ آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ لوگ خود کر لیں، یا کسی کے قصور کو معاف کرنا ہو تو معاف کر دیں، یا کسی کے جرم و گناہ پر پردہ ڈالنا ہو تو ڈال دیں۔ یہ سب کچھ عدالت میں معاملہ پہنچنے سے پہلے تک ہو سکتا ہے۔ لیکن جب عدالت تک معاملہ پہنچ جائے تو کوئی معافی اور کوئی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد تو پھر عدالت ہی قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ عدالت کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کی ہر کوشش کو آپ نے سختی کے ساتھ منع فرمادیا اور قاضی کو قرآن و سنت اور خود اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بے لاگ فیصلہ دینے کے لیے آزاد قرار دیا۔ آپ نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ علم کے بغیر فیصلہ کرنا، یا علم رکھتے ہوئے غلط فیصلہ کرنا سخت گناہ ہے۔ صحیح قاضی وہ ہے جو قانون کا علم رکھتا ہو اور اپنے علم کے مطابق بے رو رعایت فیصلہ کرے۔

اس سلسلے میں چند باتیں اور سمجھ لینی چاہییں۔ موجودہ زمانے کے سیاسی نظریات کو بنیاد بنا کر عہدِ رسالت کے معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ مثلاً اِس زمانے میں ریاست کے تین شعبے ہوتے ہیں۔ انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ۔ پھر آئینی طریقے سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ ان شعبوں کے حدود کیا ہیں۔ مگر اُس زمانے میں صورتِ معاملہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے وہاں کے بڑے بڑے گھرانوں کے الگ الگ احاطے ہوتے تھے جن کے اندر اُن کی زمینیں، اُن کے باغات، اُن کے رہنے سہنے کے گھر، اور ان کے سَقیفے (یعنی چوپالیں اور پنچایت خانے) انھی احاطوں میں ہوتے تھے۔ وہاں قبائلی نظام رائج تھا اور ہر قبیلے کے لوگ اپنے معاملات کو خود چلاتے تھے۔ مکہ معظمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اہل مدینہ کے ایک بڑے گروہ نے بیعت کی تو آپؐ نے خود اُن کی درخواست پر بارہ نقیب مقرر فرما دیے جو اپنے اپنے قبیلوں میں زیادہ قابل، زیادہ با اثر اور زیادہ با اعتماد تھے۔ اور یہ ہر نقیب کی ذمہ داری تھی کہ اُس کے قبیلے کے مختلف گھرانوں میں جو صالح اور معتبر سردار ہوں ان کی مدد سے اخلاق اور معاملات کو درست رکھیں۔ قبیلوں اور گھرانوں میں جو لوگ فطری طریقے سے سردار مانے جاتے تھے انھی میں سے ایمان لانے والوں کو آپ نے سربراہ بنا دیا تھا۔ پھر جب حضورؐ خود مدینہ تشریف لے گئے تو اس نظام کو آپ نے برقرار رکھا۔ فرق جو کچھ واقع ہوا وہ یہ تھا کہ شہر کے مشرک سرداروں

کی جگہ ایمان لانے والوں کو سرداری کا مقام حاصل ہو گیا۔ یہ تغیر ووٹوں کے ذریعے نہیں ہوا بلکہ یہ اسلامی انقلاب کا فطری تقاضا تھا کہ مشرک پیچھے ہٹتے چلے گئے اور مسلمان سردار آگے آتے گئے۔ شہر کے معاملات کو چلانے کے لیے حضورؐ مہاجرین کے اہل الرائے اور انصار کے سرداروں سے مشورہ فرماتے تھے۔ یہ موجودہ زمانے کی مقننہ یا پارلیمنٹ سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی۔ مسلمانوں میں جو لوگ بھی بااثر اور قابل تھے، خواہ وہ مہاجرین میں سے ہوں یا انصار میں سے، ہر اہم موقع پر، ہر اہم معاملے میں، جب بھی ضرورت ہوتی تھی مشورے کے لیے ان کو بلا لیا جاتا تھا۔ وہ عوام کے منتخب کیے ہوئے نہیں تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ الیکشن نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ ایسے بااثر، ذی علم اور سمجھدار لوگ تھے کہ اگر موجودہ زمانے کے طریقے پر الیکشن بھی ہوتے تو انہی کو منتخب کیا جاتا۔ ہر معاملے میں ان سب کا بلایا جانا ضروری نہ تھا۔ جس وقت کسی مسئلے میں مشورے کی حاجت پیش آتی اس وقت جو لوگ بھی موجود ہوتے ان سے رائے لے لی جاتی۔ اور بڑے اہم مسائل میں بس یہ اعلان کرا دیا جاتا کہ مسجد نبوی میں لوگ حاضر ہو جائیں۔

مدینے سے باہر جب اسلامی مملکت پھیلنی شروع ہوئی تو مختلف علاقوں میں گورنر مقرر کر دیے گئے۔ وہی اپنے علاقے کے منتظم بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ اس زمانے میں کوئی مستقل فوج نہیں تھی۔ جس وقت بھی ضرورت ہوتی رضاکارانہ طور پر لوگ جہاد کے لیے آجاتے تھے۔ حضورؐ نے مختلف علاقوں میں قاضی بھی مقرر فرما دیے تھے جن کے عدالتی کام میں کوئی گورنر دخل نہ دے سکتا تھا۔ آپ نے ہر علاقے میں ایسے لوگ بھی مقرر کیے تھے جو باشندوں کو اسلام کی تعلیم دیں۔ تعلیم سے مراد یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ وہ عوام کو قرآن سنائیں۔ اس کے معانی و مطالب سمجھائیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ان کو آگاہ کریں۔ یہ کام زیادہ تر زبانی تلقین کے ذریعے سے کیا جاتا تھا اور معلّمین لوگوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت اسی طریقے پر کرتے تھے جس طریقے پر حضورؐ نے خود ان کی تربیت فرمائی تھی۔ مثال کے طور پر جب مکہ معظمہ فتح ہوا تو حضورؐ نے حضرت عتّابؓ بن اسید کو گورنر اور حضرت معاذ بن جبل کو معلم مقرر فرمایا تھا۔

زکوٰۃ کے نظام کی صورت یہ تھی کہ کہیں آپ نے باقاعدہ تحصیل دار مقرر کیے تھے، اور بعض علاقوں میں قبیلوں کے سرداروں کو اس کی تحصیل کا کام سپرد فرما دیا تھا۔ جہاں غیر مسلم آبادی نے اطاعت قبول کر کے خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا وہاں بھی خراج کی تحصیل کے لیے کوئی مستقل تحصیلدار مقرر نہ تھا۔ جب

خیبر فتح ہوا اور وہاں کے باشندوں نے نصف پیداوار ادا کرنا قبول کر کے صلح کر لی تو فصل کی کٹائی کے وقت حضورؐ کسی صحابی کو بھیج دیتے تھے اور وہ پیداوار کا نصف نصف الگ کر کے یہودیوں کو اختیار دے دیتے تھے کہ دونوں ڈھیروں میں سے جو ڈھیر چاہیں اُٹھا لیں۔ تاریخ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ جب اس طریقے پر خراج لیا گیا تو یہودی پکار اُٹھے کہ اسی انصاف پر زمین و آسمان قائم ہیں۔

یہ ہے حضورؐ کے نظام حکومت کا ایک مختصر خاکہ۔

سوال - مولانا اس ساری تفصیل کے بعد جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام حکومت کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے آدمی کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج نہ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جیسی جامع شخصیت موجود ہو سکتی ہے، نہ آج ایسا کوئی تربیت یافتہ گروہ موجود ہے جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کی صورت میں تیار فرمایا تھا، اور نہ وہ اخلاقی تربیت اور وہ معاشرہ موجود ہے جس معاشرے کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار فرمایا تھا۔ اب اگر آج اس بگڑے ہوئے معاشرے میں ہم اسلام کے نظام کو نافذ کرنے کی تیاری کریں تو اس میں اوّل تو اُن چاروں خصوصیات کو جو آج کے دورِ جدید کی ریاست کی خصوصیات تصور کی جاتی ہیں کس طرح سے اسلامی نظام کے سانچے میں ڈھالا جائے گا؟ دوسرے یہ کہ آج اس بگڑے ہوئے معاشرے کو اُس معیاری معاشرے میں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ تبدیل کیا جائے؟ اس پر آپ کچھ اظہارِ خیال فرمائیں گے؟

جواب - اس معاملے میں سب سے پہلی بات جو سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ جس چیز کا نام اسلامی نظام ہے وہ کسی بے ایمان اور بدکردار حکومت کے ہاتھوں سے نہیں چل سکتا - کوئی خدا سے بے خوف بیوروکریسی اسے نہیں چلا سکتی - کسی ایسی آبادی میں وہ ٹھیک طور سے نہیں چل سکتا جس کی اخلاقی حالت بالعموم خراب ہو اور خراب کی جاتی رہی ہو - ہم نے ایک مدت تک بادشاہی نظام کے تحت زندگی بسر کی ہے جو پوری طرح اسلامی نظام نہیں تھا - مگر پھر بھی اُس میں اسلامی قانون رائج تھا اور عام لوگوں کی تعلیم و تربیت کا کام علماء اور صوفیہ انجام دیتے تھے - اس وجہ سے اگرچہ وہ معاشرہ اُس درجہ کا نہیں تھا جس درجے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں تھا - لیکن اس کے باوجود نہ لوگوں کی عام اخلاقی حالت اتنی بگڑی تھی جتنی بعد میں بگڑی، اور نہ لوگ اسلام کے علم سے اس قدر بے بہرہ تھے جس قدر بعد میں ہوئے - شراب نوشی مسلمانوں میں تقریباً ناپید تھی - لوگ گناہ کرتے تھے مگر علانیہ بے باکی کے ساتھ نہ کرتے تھے ---

اٹھارھویں صدی کے وسط میں جب انگریزی حکومت اوّل اوّل بنگال میں قائم ہوئی، اُس زمانے کے بعض انگریز مصنفین لکھتے ہیں کہ چوری وہاں ناپید تھی اور چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے جھوٹ کی کوئی توقع نہیں کرتا تھا۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کرسکتا تھا کہ عدالت میں جاکر کوئی مسلمان جھوٹی گواہی دے گا۔ مسلمانوں کی عام آبادی لکھی پڑھی تھی بلکہ سو فیصد مسلمان خواندہ تھے۔ یہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک ہماری حالت تھی۔ بعد میں جب انگریزی دور آیا تو اُس نے ہمارے قوانین کو بدلا۔ ہمارے معاشی نظام کو بدلا۔ ہمارے معاشرتی نظام پر بدترین اثرات ڈالے۔ اسلامی تعلیم بالکل اس بات پر منحصر ہوگئی کہ کھاتے پیتے لوگ مدد کریں تو اسلامی مدارس چل سکیں۔ حکومت نے ان مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر دیے۔ اس کے برعکس جو نظامِ تعلیم انگریزوں نے رائج کیا وہ مسلمانوں کے ذہن سے خدا اور رسول اور آخرت کے تصورات کو بالکل مٹا دینے والا تھا، اور رزق کے دروازے اُسی کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ ہم نے انگریزی دور سے میراث میں پایا۔ افسوس ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ انگریزی دور میں ہم جتنے بگڑے ہوئے تھے اُس سے زیادہ اِس تیس سال کے زمانے میں بگڑ گئے۔ اب اگر کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ چھوٹتے ہی مثالی نظام کی طرف پلٹ جائے گی۔ آغازِ کار میں اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ اِس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو ملک کے تمام ذرائع و وسائل، ملک کے تمام ذرائعِ ابلاغ، ملک کے سارے نظامِ تعلیم، اور حکومت کی پوری انتظامی پالیسی کو اِس غرض کے لیے استعمال کریں کہ مسلمانوں میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور اُن کی عام اخلاقی حالت کو درست کیا جائے۔ جس قدر اسلام کا علم پھیلے گا اور عام اخلاقی حالت درست ہوتی جائے گی اتنی ہی زمین اسلامی نظام کے لیے تیار ہوتی چلی جائے گی۔

یہی چیز تھی جس کی ہم توقع رکھتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خاتمے کے بعد جب پاکستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ اِس طریقِ کار کو اختیار کرے گی۔ ذرائعِ ابلاغ کی پوری طاقت عام مسلمانوں میں ایمان اور صحیح اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے استعمال کرے گی۔ نظامِ تعلیم کو ایک اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کے کارکن اور شہری تیار کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔ الحاد پیدا کرنے والی تعلیم کو بدلا جائے گا اور اُس کی جگہ خدا پرستی کی تعلیم کو رائج کیا جائے گا۔ عام لوگوں کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا کرتے

کی کوشش کی جائے گی ۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان میں سے کوئی توقع بھی پوری نہیں ہوئی ۔ اگر اُس وقت حکومت اپنے تمام ذرائع و وسائل کو اس کام کے لیے استعمال کرتی تو آج حالت بالکل مختلف ہوتی ۔

اب ہمیں گویا بالکل نئے سرے سے کام کرنا ہے ۔ بے شک اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی کوشش کیجیے ۔ قوانینِ اسلامی کو مدوّن بھی کیجیے تاکہ ہماری عدالتیں ان کے مطابق فیصلے کرسکیں ۔ مگر بس یہی ایک کام ایسا نہیں ہے جس سے اسلامی نظام قائم ہو جائے ۔ سب سے زیادہ زور جس بات پر صرف کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں اور ہمارے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی تعلیم دی جائے ۔ ذرائعِ ابلاغ کو فحش اور بے حیائی اور بداخلاقی اور جرائم پھیلانے کے بجائے مسلمانوں کو ایمان اور اسلامی عقائد سمجھانے اور ان کے ذہن نشین کرنے پر صرف کیا جائے ۔ عام لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اسلامی اخلاق کیا ہیں اور کافرانہ اخلاق کیا، اور دونوں قسم کے اخلاقوں میں فرق کیا ہے ۔ پہلے میں بیان کرچکا ہوں کہ اسلامی نظام تو قائم ہی اُس معاشرے میں ہوا تھا جس کے اندر سب سے پہلے ایمان کو مستحکم کیا گیا تھا، پھر اُسی ایمان کی مضبوط بنیاد پر پورے اخلاقی نظام کی، پورے معاشرتی نظام کی، پورے معاشی نظام کی، پورے سیاسی نظام اور پورے قانونی نظام کی عمارت اُٹھائی گئی تھی ۔ اب اگر ہم اُس مثالی دَور کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں تو ہمیں اِسی ترتیب سے پلٹنا چاہیے ۔ عام مسلمانوں کے دلوں میں اگر خدا پر ایمان، رسول پر ایمان، قرآن پر ایمان اور آخرت پر ایمان مضبوطی کے ساتھ نہ بٹھایا گیا تو محض قوانین کو بدلنے سے کام نہ چلے گا ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں جھوٹے مقدمات بنانے میں پولیس اتنی مہارت رکھتی ہے کہ وہ ساری دُنیا کو چیلنج دے سکتی ہے کہ ہمارے مقابلے میں کوئی جھوٹا مقدمہ بنا کر دکھائے ۔ گواہوں کا حال یہ ہے کہ عدالت میں جاکر صحیح گواہی دینا گویا گناہ سمجھا جاتا ہے ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ عدالت تو ہے ہی جھوٹی شہادت دینے کی جگہ ۔ پولیس خود بھی جھوٹے گواہوں کا ایک پورا گروہ تیار رکھتی ہے ۔ یہی دو چیزیں اگر نگاہ میں رکھی جائیں تو آپ اندازہ کرلیجیے کہ ہمارے ہاں اسلامی قانون صحیح طور پر کیسے نافذ ہوگا جب کہ اُس کو نافذ کرنے والی مشینری ہی بگڑی ہوئی ہے ۔ قوانینِ اسلامی کے نفاذ کی تدبیریں کرنے کے ساتھ موجودہ حکومت کے لیے بھی اور آئندہ آنے والے حکمرانوں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ملک کی انتظامیہ کو بھی درست کریں، تعلیم کے نظام کی بھی اصلاح کریں اور ملک کے تمام ذرائع و وسائل کو اس بات پر صرف کردیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان بٹھایا جائے، اُن کے اخلاق درست کیے جائیں، اور اُن کے اندر خدا کا خوف پیدا کیا جائے ۔

سوال:۔ جناب والا کہا یہ جاتا ہے کہ یہ قوم ڈنڈے کی غلام ہے۔ یہ ایک عام ضرب المثل ہے جو لوگوں کی زبانوں پہ چڑھی ہوئی ہے۔ لیکن کیا اسلامی نظام بھی ڈنڈے کے زور سے قائم کیا جاسکے گا؟

جواب:۔ اسلامی قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اسلام میں ترتیب کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعے سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں۔ پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے بڑے پیمانے پہ کام کیا جائے، یہاں تک کہ محلے محلے، بستی بستی، اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداریوں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں میں دین داری اور دیانت داری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی عام رائے کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی اور جو شخص صحیح طرزِ زندگی اختیار کرے گا اُس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہوگا۔ اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں۔ ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنے اُوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے اگر اُس کو معلوم ہو کہ اُس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو، زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کر دیے جائیں، رزق حلال کمانے کے لیے تمام مواقع لوگوں کے لیے کھول دیے جائیں۔ اور کوئی آدمی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ اِن تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف، اصلاح معیشت، اور ایک پاکیزہ رائے عام کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے۔ اور ڈنڈا پھر اُس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ اُن تمام لوگوں کے دماغ کا آپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اُس کی سخت سزاؤں پہ گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے۔ پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عام تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر وہ معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا

آسان ہو جائے۔ وہ اُن تمام دروازوں کو بند کرتا ہے جن سے فواحش و جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اِس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اُٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اُس سے بڑا ظلم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لیے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو ایمان کی طرح نگل جاتا ہے۔

سوال: حکومت کے سلسلے میں آپ نے یہ جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، انتہائی صحیح بات ہے۔ جب تک ایسا نظام وجود میں نہ آجائے، ایسے لوگوں پر وہ نظام مشتمل نہ ہو جو ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اسلام کو نافذ کرنا چاہتے ہوں بلکہ اخلاقی اعتبار سے اور علمی اعتبار سے بھی وہ اس منصب اور اس معیار کے لوگ ہوں کہ وہ اس کام کو انجام دے سکیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں حکومت کی تبدیلی کے لیے انتخابات ہی کو ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کو سامنے رکھتے ہوئے کیا آپ اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ اِس مغربی اندازِ انتخابات کو کس حد تک اسلام کے شورائی نظام سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح؟

جواب: یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ ہم اِس وقت جس مقام پر کھڑے ہیں اِسی مقام سے ہمیں آگے چلنا ہو گا اور جس منزل تک ہم جانا چاہتے ہیں اُس کو واضح طور پر نگاہ کے سامنے رکھنا ہو گا تاکہ ہمارا ہر قدم اُسی منزل کی طرف اُٹھے۔ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں، نقطۂ آغاز تو لامحالہ یہی انتخابات ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے ہاں اِسی طریقے سے نظامِ حکومت تبدیل ہو سکتا ہے اور حکمرانوں کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا ذریعہ اِس وقت ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہم پُرامن طریقے سے نظامِ حکومت بدل سکیں اور حکومت چلانے والوں کا انتخاب کر سکیں۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے ہاں انتخابات میں دھونس، دھوکے، دھاندلی، علاقائی یا مذہبی یا برادری کے تعصبات، جھوٹے پروپیگنڈے، گندگی اچھالنے، ضمیر خریدنے، جعلی ووٹ بھگتانے اور بے ایمانی سے انتخابی نتائج بدلنے کے غلط طریقے استعمال نہ ہو سکیں۔ انتخابات دیانتدارانہ ہوں۔ لوگوں کو اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے۔ پارٹیاں اور اشخاص جو بھی انتخابات میں کھڑے ہوں وہ معقول طریقے سے لوگوں کے سامنے اپنے اصول، مقاصد اور پروگرام پیش کریں، اور یہ بات اُن کی اپنی رائے پر چھوڑ دیں کہ وہ کسے پسند کرتے ہیں اور کسے پسند نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے انتخاب میں ہم عوام کے طرزِ فکر اور معیارِ انتخاب کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن اگر انتخابی نظام درست

رکھا جائے تو ایک وقت ایسا آئے گا جب نظامِ حکومت پورے کا پورا ایماندار لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ اس کے بعد ہم نظامِ انتخاب پر نظرِ ثانی کر سکتے ہیں اور اس مثالی نظامِ انتخاب کو از سرِ نو قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو اسلامی طریقے کے عین مطابق ہو۔ بہر حال آپ یک لخت جست لگا کر اپنی انتہائی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

سوال:۔ مولانا یہاں کچھ سوال اگرچہ اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے اور آپ سے کسی اور نشست میں کوئی سوال کرنے کا موقع میسر آئے۔ ایک بات میں آپ سے آخر میں ضرور معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ نے جس مشن کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور جس طرح آپ نے اس کے لیے پوری عمر جدو جہد کی اور آج الحمدللہ ایک ایسے مقام پر ہم پہنچ چکے ہیں کہ جہاں وہ نصب العین اب اپنی منزل کے قریب پہنچتا نظر آتا ہے۔ میں آپ سے یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ اس ساری صورتِ حال کو اپنی اِس جدو جہد کی روشنی میں کس طرح سے محسوس کرتے ہیں اور کیا آپ کی نظر میں اب آپ کی یہ جدو جہد فی الواقع اپنے منطقی نتیجے تک پہنچ رہی ہے اور کیا فی الواقع آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے ؟

جواب:۔ یہ میرے لیے ایک بڑا مشکل سوال ہے۔ میں نہ غلط دعوے کر سکتا ہوں اور نہ خود ستائی کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ پچھلے تیس چالیس سال کے دوران میں اسلامی خیالات کی اشاعت کا کام جتنے بڑے پیمانے پر ہوا ہے' اور وہ صرف میں نے ہی نہیں کیا ہے، دوسرے لوگوں نے بھی کیا ہے' اس کے نتیجے میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت اب اسلام کی خواہاں ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کے اخلاق بالکل اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہو سکے، لیکن اس میں اسلام کی سمجھ اور اسلامی نظام قائم کرنے کی تڑپ ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری جو درسگاہیں میکالے کے نظامِ تعلیم پر قائم تھیں، خدا کے فضل سے انہی میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو اسلام سے گہری قلبی عقیدت بھی رکھتی ہے اور اسلام کا فہم بھی بڑی حد تک اس کو حاصل ہو چکا ہے۔ اب ہمارے سامنے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری عام آبادی جو اَن پڑھ ہے اس کے اندر کس طرح اسلام کے علم و فہم کو پھیلایا جائے۔ چونکہ رائے دہندوں کی اکثریت اَن پڑھ ہے، اس لیے تعلیم یافتہ لوگوں کی سو فیصد تعداد بھی اگر ایک صحیح انتخاب کرنا چاہے تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اِس مرحلے پر میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اور علماء کرام شہروں، قصبوں اور دیہات کی اَن پڑھ آبادیوں میں دینِ اسلام کی واقفیت پیدا کرنے میں لگ جائیں۔ اِس کے لیے لوگوں کا خواندہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابوں کے ذریعے سے دین نہیں پھیلا تھا، زبانی تلقین سے پھیلا تھا۔ اب بھی یہ ضروری نہیں کہ ہم اِن سب کو پہلے پڑھا لکھا بنائیں پھر انھیں دین سمجھائیں۔ عہدِ رسالت کی طرح آج بھی عام لوگوں کو زبانی تعلیم سے دین سمجھایا جا سکتا ہے۔ اسلام کے عقائد اور اصولِ اخلاق سے اُنھیں آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ فرائض اور ارکانِ دین کی اہمیت ان کے ذہن نشین کی جا سکتی ہے۔ حرام و حلال کی تمیز ان میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ بڑے بڑے گناہوں کا خوف اُن کے دلوں میں بٹھایا جا سکتا ہے۔ نیکیوں کے اجر کی رغبت انھیں دلائی جا سکتی ہے۔ قرآن کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، جنھوں نے عرب کی دنیا بدل ڈالی تھی، آج بھی اپنا معجزنما اثر دکھا سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم اُن سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لینا چاہیں۔

بڑی اہمیت اِس بات کی ہے کہ قرآن اور حدیث کی صاف صاف تعلیمات پیش کر کے ہم لوگوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کریں کہ تم سب کی نگاہوں سے چھپ سکتے ہو مگر خدا سے نہیں چھپ سکتے۔ سب کی سزا سے بچ سکتے ہو مگر خدا کی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ تمھارا پورا اعمال نامہ تیار ہو رہا ہے۔ ایک دن تمھیں یقیناً مرنا ہے اور قیامت کے روز خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ تم نماز ترک کرو، رمضان میں عَلانیہ کھا پی کر خدا کے دین کی توہین کرتے رہو، بے باکی کے ساتھ گناہوں کی گندگی میں لت پت ہو جاؤ، لوگوں کے حقوق مار کر خدا کے سامنے جاؤ، لوگوں کی عزت و آبرو لُوٹ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو، لوگوں کی جانیں لے کر وہاں جاؤ، پھر اللہ کی عدالت سے چھوٹ جاؤ۔ اِس دنیا میں تم چالبازیاں کر کے بچ سکتے ہو، خدا کی عدالت سے کیسے بچو گے؟ یہ چیزیں آپ عام لوگوں کے دماغ میں بٹھائیں تو رفتہ رفتہ آپ دیکھیں گے کہ ہماری عام آبادی کے اندر صحیح سمجھ بوجھ اور اخلاقی حس پیدا ہو جائے گی۔

اِس کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اب ہمیں اپنے ملک میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے تو انتخابات کے موقع پر وہ خود ہی سوچیں گے کہ اس کام کے لیے ہم کیسے لوگوں کو آگے لائیں۔ عام لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ وہ بیمار ہوں تو کس ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ اس بات کو جانتے ہیں کہ کوئی مقدمہ پیش آجائے تو کس وکیل کے پاس جائیں۔ اِسی طرح جب آپ لوگوں میں اسلام کا شعور اور سمجھ پیدا کر دیں گے تو وہ

خود ہی دیکھ لیں گے کہ اسلامی نظام چلانے کے لیے وہ کن لوگوں کو منتخب کریں۔ پہلی بار اگر وہ کچھ غلطی کر بھی جائیں گے تو انشاءاللہ دوسری مرتبہ نہ کریں گے، بشرطیکہ تعلیم عوام کا عمل برابر جاری رہے، اور حکمران اسلام سے ہٹ کر جو کام بھی کریں اس پر معقول و مدلل تنقید کی جاتی رہے۔ بالفرض اگر غلط آدمیوں کی اکثریت منتخب ہو جائے اور وہ دوسرا انتخاب ناجائز ذریعوں سے جیتنے کی کوشش کریں تو انہیں ویسی ہی تحریک کا سامنا کرنا ہوگا جس نے بھٹو جیسے جابر کے قدم اکھاڑ دیے۔

تعلیم عوام کی بعض صورتیں خاص بھی ہیں جن کی خصوصیات کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ مثلاً مزدوروں کی یونینیں ہیں۔ مزدوروں میں عام طور پر اس خیال کو پھیلایا جائے کہ تمہارے لیے منصفانہ معاشی نظام سوشلزم نہیں ہے اسلام ہے۔ تمہاری مشکلات اُسی کی پیروی سے رفع ہوں گی۔ کوئی انصاف سوشلزم نے مزدوروں کے ساتھ نہ کبھی کیا ہے، نہ آج کر رہا ہے اور نہ آئندہ کرے گا۔ سوشلزم، کمیونزم، اور اشتراکی ملکوں کے حالات کا مطالعہ جن نوجوانوں نے کیا ہے وہ ناقابلِ انکار دلائل وشواہد کے ساتھ مزدوروں کو یہ بات سمجھا سکتے ہیں۔ اس طریقے سے مزدور تحریکوں کو رفتہ رفتہ اسلامی تحریکوں میں تبدیل کر دیا جائے اور مزدوروں میں یہ شعور پیدا کر دیا جائے کہ وہ جانچ پرکھ کر دیکھ لیں کہ اُن کے لیڈر مارکس اور لینن کے ماننے والے ہیں یا اللہ اور رسول کے ماننے والے۔ پھر یہ فیصلہ انہی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ حشر کے روز مارکس اور لینن کے سامنے اُٹھنا چاہتے ہیں یا رسول رب العالمین کے سامنے۔

اسی طرح سے مثلاً کسان اپنے کچھ الگ مسائل رکھتے ہیں۔ ان کا اسلامی حل بھی انہیں سمجھایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لے گئے تھے تو وہاں کے انصار زراعت پیشہ لوگ تھے۔ اسلام سے قبل ان کے ہاں زمیندار اور کسان اور مزارع کے جھگڑے برپا تھے، اور دیہات سے غلہ لانے والوں کو شہری تاجر اور دلال بُری طرح لوٹتے تھے۔ حضورؐ وہاں پہنچے تو آپ نے انصاف کے ساتھ ان سب خرابیوں کی اصلاح کی اور اُس اصلاح کی تفصیلات احادیث میں موجود ہیں۔ انہیں آج بھی کسانوں کو بتا کر آپ مطمئن کر سکتے ہیں کہ ان کے مسائل کا عادلانہ حل اسلام ہی نے کیا ہے اور وہی کر سکتا ہے۔

یہ کام جتنا جتنا ہوتا جائے گا آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ انتخابات کے نتائج صحیح ہوتے چلے جائیں گے۔ اور جتنے جتنے دین کو جاننے والے ایماندار آدمی اکثریت سے منتخب ہوں گے اتنے ہی ہم خلافت راشدہ کے مثالی نظام کی طرف قدم بڑھاتے چلے جائیں گے۔

سوال:۔ جناب والا یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اسلامی نظام بتدریج قائم کیا جانا چاہیے اور قائم کیا جائے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تدریجی تغیر کے دوران میں ہمارے موجودہ قوانین اور مغربی طرز کی جمہوریت کے تحت بنائے گئے قوانین چلتے رہیں گے؟ کیا یہ دو متضاد چیزیں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں؟

جواب:۔ مدتوں کے بگڑے ہوئے پورے نظام زندگی کو ہمیں بتدریج ہی بدلنا ہوگا۔ انگریزی دور کے نظام تعلیم کو یکایک بدل کر ایک ہی دن میں اسلامی نظام تعلیم رائج نہیں کیا جا سکتا۔ عام لوگوں کی اخلاقی حالت بھی جو سالہا سال سے سنیما اور فحش تصاویر اور شب و روز کے گانوں اور زن و مرد کی مخلوط سوسائٹی اور شراب، جوئے اور دوسرے حرام افعال کی بدولت بگڑتی رہی ہے، اسے بھی ایک دن میں نہیں بدلا جا سکتا۔ لیکن ہمیں آج ہی سے ان کو بدلنے کی کوشش شروع کرنی ہوگی، اور جن جن برائیوں کو جس قدر جلدی مٹانا ممکن ہوگا اسے مٹانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی جائز نہ ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح ہمیں قوانین کے معاملے میں بھی کرنا ہوگا۔ کافرانہ دور کے جن قوانین کو اسلامی قوانین سے بدلنا آج ممکن ہو اسے آج ہی بدل ڈالیے، اور جتنا جتنا اسلامی قانون کو نافذ کرنا ممکن ہوتا نظر آئے اس کے نافذ کرنے میں قطعاً دیر نہ لگائیے۔ کیونکہ ایک حکومت جو حقیقت میں مسلمان ہو اور جس کے پیش نظر یہ ہو کہ اسلام عملاً قائم کرنا ہے، اُسے سارے شعبوں میں ایک ساتھ تبدیلی لانی ہوگی۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ جب تک ساری اصلاحات مکمل نہ ہو جائیں، اسلامی قانون نافذ نہ کیا جائے۔ اگر ہمارے جج غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنے شروع کر دیں گے تو اس سے خود بخود عام لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اب یہاں کافرانہ نظام نہیں چلے گا اور اسلامی قانون ہی رائج ہوگا۔ یہ منجملہ اُن چیزوں کے ہے جن سے آپ کو عوام کے خیالات تبدیل کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ اس کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں کہ انگریزوں نے جب ہمارے قوانین کو متروک کر کے اپنے قوانین رائج کیے اور اُن کے مجسٹریٹوں اور ججوں نے اُن قوانین کے مطابق فیصلے کرنے شروع کر دیے تو رفتہ رفتہ ہمارے معیار بدلتے چلے گئے۔ حرام حلال ہو گیا اور حلال حرام۔ جو چیزیں انگریزی قانون نے اخلاق، معیشت، معاشرت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جائز کی تھیں وہی ہمارے نظام زندگی میں رائج ہو گئیں خواہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کتنی ہی غلط بلکہ قابل نفرت ہوں۔ ہم خود اپنے قانون کو فرسودہ سمجھنے لگے۔ ہمارے دماغ میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ اسلام کا قانون تو صرف نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے لیے ہے۔ باقی

دنیا کے معاملات چلانے کے قابل نہیں ہے۔ اب جونہی کہ لوگ اسلامی قانون کو عدالتوں میں چلتے دیکھیں گے، تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگے گی اور دماغوں پر سے انگریزی قانون کا تسلط ٹوٹنا شروع ہو جائے گا۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ زندگی کے صرف ایک شعبے یا بعض شعبوں میں اصلاح کا کام کیا جائے اور دوسرے شعبوں میں پرانے طریقوں کو رائج رکھا جائے۔

انتخابات ہی کے معاملے کو لے لیجیے۔ بظاہر یہ صرف ایک شعبۂ زندگی ہے۔ مگر اس کی اصلاح پورے نظامِ حیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے ان انتخابات کا جو طریقہ رائج رہا ہے وہ یہ ہے کہ جھوٹے وعدے کرو، لوگوں کو بیوقوف بناؤ، اُن کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاؤ، لوگوں کے ووٹ خریدو، مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال کر ووٹ حاصل کرو، مخالفین پر خوب کیچڑ اچھالو، برادریوں اور علاقوں کے تعصبات پھیلاؤ، مذہبی جھگڑے برپا کرو، غرض جس طریقے سے بھی ممکن ہو قوم کی گردن پر سوار ہو جاؤ۔ اس ساری صورتِ حال کو آپ تبدیل کیجیے، ان ناجائز ہتھکنڈوں کو بند کر دیجیے اور عام لوگوں کو آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کرنے کا موقع دیجیے۔ آپ یقین رکھیے کہ بہت بڑی اصلاح تو اسی سے ہو جائے گی۔ بُرے آدمیوں کا اُوپر آنا مشکل ہو جائے گا اور اچھے آدمیوں کا آنا ممکن ہو جائے گا۔

سوال: جناب والا۔ اسلام کی تشہیر و تبلیغ کے لیے کچھ تو موجودہ ذرائع ہیں۔ مزید کیا طریق کار اختیار کیے جانے چاہییں۔ آپ کچھ نصیحت فرمائیں گے؟

جواب: یہ ساری چیزیں تو ایک حد تک میں اپنی کتابوں میں لکھ چکا ہوں اور میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے کہ جو کچھ پہلے لکھ چکا ہوں اُسے اب زبان سے بیان کروں۔

سوال: جناب والا۔ مولانا محترم میں یہ گذارش کروں گا کہ ہمیں تلقین فرمائیں کہ ہم اس سلسلے میں ریڈیو کو کیونکر استعمال کر سکتے ہیں؟

جواب: ریڈیو کو استعمال کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے جو ایک ایک موضوع پر تیاری کر کے ریڈیو پر آکر تقریر کریں۔ مثلاً کچھ لوگ ایسے ہونے چاہییں جن کا آپ سوچ سمجھ کر اس کام کے لیے انتخاب کریں کہ وہ اسلام کے ایمانیات کی تشریح کریں اور طرح طرح سے اُن کے ہر پہلو کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں۔ ایک ہی آدمی یہ کام کرے گا تو لوگ اُکتا جائیں گے۔ مختلف قابلیتوں کے لوگ اپنے اپنے طریقے پر بات سمجھائیں گے تو سننے والے دلچسپی کے ساتھ اُن کی باتیں سنیں گے،

اسلامی اعتقادات کو دماغوں میں اُتار دینا سب سے پہلا اور سب سے بڑا بنیادی کام ہے جس سے مسلمانوں کی ذہنی حالت بدل جاسکتی ہے اور انہیں اسلام کے دوسرے حقائق کو سمجھنے کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کچھ دوسرے لوگ ایسے منتخب کرنے چاہییں جو اسلامی عبادات کی اہمیت، ان کے بے شمار دینی و دُنیاوی فوائد، اور اُن کو چھوڑ دینے کے نقصانات دل نشین انداز میں طریقے سے سمجھائیں۔ کچھ اور مقررین اسلام کے اخلاقی اصول، اس کے احکام اور اس کی ہدایات بیان کرنے کے لیے انتخاب کیے جائیں۔ کچھ دوسرے لوگ معاشرے میں پھیلی ہوئی بُرائیوں پر ایسے مؤثر انداز میں تنقید کریں جس سے عام لوگوں میں یہ احساس بیدار ہو کہ وہ کیسی گندگیوں میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ اور لوگ خصوصیت کے ساتھ کبائر میں سے ایک ایک بڑے گناہ پر پے در پے تقریریں کریں جن سے لوگوں کو یہ احساس ہو کہ یہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کو برباد کر دینے والے کیسے سخت گناہ ہیں اور خدا کے ہاں اِن کا کیسا دردناک عذاب اُنھیں بھگتنا پڑے گا۔ مثلاً قتل ہی کو لے کر اس کے نتائج ایک ایک کر کے بتائے جائیں۔ ایک آدمی اگر دس آدمیوں کو قتل کر دیتا ہے تو دُنیا میں اس کو ایک ہی سزائے موت ملے گی۔ باقی ۹ کا عذاب تو دنیا کی عدالت نہیں بلکہ خدا کی عدالت ہی دے گی۔ ایک آدمی کے قتل پر بھی دُنیا کی عدالت بس ایک ہی بار سزائے موت دے گی۔ لیکن مقتول کے خاندان اور اس کی آئندہ نسلوں کو اس کا جو نقصان اُٹھانا ہوگا، اور جب تک اُٹھانا ہوگا اس کا حساب تو دُنیا کی عدالت کسی طرح لگا ہی نہیں سکتی۔ یہ حساب تو خدا لگائے گا اور جہنم میں قاتل کو اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

ریڈیو پر اس طرح کی تقریروں کا سلسلہ اگر جاری ہو جائے اور موزوں آدمی اپنے اپنے موضوعات پر پوری اثر آفرینی کے ساتھ کلام کریں تو آپ دیکھیں گے کہ چھ مہینے میں فرق عظیم واقع ہو جائے گا۔ ریڈیو تو عوام کو تعلیم دینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ آج کسان کھیت میں ہل تک نہیں چلا سکتا جب تک ٹرانسسٹر اس کے پاس نہ ہو۔ اب تک یہ لوگ ان ٹرانسسٹروں سے بیگمات کے گانے اور اُن سے بھی کچھ زیادہ ہی فحش فلمی اور فرمائشی گانے سُنتے ہیں۔ آئندہ اگر یہی لوگ دلچسپ اور عام فہم زبان میں کچھ اپنے دین کی باتیں بھی سُننے لگیں تو اُمید نہیں ہے کہ خدا کا نام سُنتے ہی ٹرانسسٹر بند کر دیں گے۔ یہ لوگ آخر خدا اور رسول اور آخرت کے منکر تو نہیں ہیں۔ آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ اُن کے اندر دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس پروگرام کا آغاز کچھ عہدِ رسالت، عہدِ خلافت اور عہدِ صحابہ کے واقعات اور صالحین کی حکایات سے کریں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ انہیں اسلامی تعلیمات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔ اِن

سادہ لوح دیہاتیوں میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جان نثار نہ ہو۔ آپ انہیں بتا سکتے ہیں کہ جن رسول پاک پر تم جان نثار کر دینے کے لیے تیار رہو ان کے احکام کی پیروی بھی تو کرو۔ اُن میں کون ہے جو یہ نہ مانتا ہو کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے؟ آپ انہیں بتائیے کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ اس کی تفصیلات قرآن اور احادیث سے اُن کو سنائیے۔ بعید نہیں کہ اُن کو سُن کر اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ صرف عذابِ قبر ہی کا ذکر سُن کر وہ لرز جائیں گے۔

سوال:۔ جناب والا ہم ریڈیو سے کسانوں کے لیے، کاشتکاروں کے لیے خصوصی پروگرام بھی کرتے ہیں۔ مزدوروں کے لیے بھی پروگرام کرتے ہیں، محنت کشوں کے لیے بھی، خواتین کے لیے بھی، بچوں کے لیے بھی پروگرام کرتے ہیں۔ تو ہم صرف گانے ہی تو نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پروگراموں کی بھی نوعیت ایسی نہ ہو جیسی کہ مطلوب ہے؟

جواب:۔ میرا کہنا یہ ہے کہ آپ کے ہاں ریڈیو میں زیادہ عنصر گانے بجانے کا ہوتا ہے، اور کم عنصر دین و اخلاق کی تعلیم کا۔ پہلے عنصر کو آپ یک لخت ختم کر دیں گے تو وہ دوسرے ملکوں سے گانے سُننے لگیں گے۔ اس کے بجائے آپ پہلے عنصر کو کم کرتے جائیں اور دوسرے عنصر کو بڑھاتے چلے جائیں۔ جب عوام کو صحیح طریقے سے دین سمجھایا جائے گا اور انہیں دلچسپ اور دل نشیں طریقے سے بتایا جائے گا تو وہ گانے کے رسیا نہ رہیں گے اور انہیں باہر کے ریڈیو سے بھی گانا سُنتے وقت یہ یاد آ جائے گا کہ قیامت کے روز اُن کے کان گواہی دیں گے کہ یہ لوگ اُن سے کیا چیزیں سننے کا کام لیتے رہے ہیں۔

تعزیراتِ اسلام

(۶)

از جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب

فصل دوم

ذرائعِ ثبوتِ جرمِ قطع الطریق

دفعہ ۲۲ قطع الطریق (رہزنی) کا جرم اقرار یا شہادت کے ذریعہ ثابت ہوگا اور ان ذرائع کے تحت حد سرقہ میں جس تفصیل کا ذکر کیا گیا ہے اس کا اعتبار یہاں بھی کیا جائے گا۔

فصل سوم

قطع الطریق کی سزا

دفعہ ۲۳ (۱) جو فرد یا جماعت قطع الطریق کا ارتکاب کرے اس کو تفصیل ذیل سزا دی جائے گی۔ پہلی چار سزاؤں کا اجرا بطورِ حدّ ہوگا۔ آخری دو سزاؤں کا حد میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ اور حد کے اجراء سے حقوق العباد ساقط ہوں گے ورنہ نہیں[1]۔

۱۔ اگر مجرم نے صرف ڈرانے اور دھمکانے پر اکتفا کیا ہو تو اس کو پیٹنے کے بعد قید کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ سچی توبہ کرے یا مرجائے۔ سچی توبہ کے لیے ضروری ہے کہ اس سے نیک بن جانے کی علامات ظاہر ہوں[2]۔

---

[1] احکام القرآن للجصاص ص ۴۱۲ ج ۲۔

[2] ردالمحتار ص ۲۱۹ ج ۳۔

تشریح :- اس سزا کی بنیاد قرآن حکیم کی آیت "اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ" پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قطع الطریق کے مجرمین کو زمین سے نکال دیا جائے۔

زمین سے نکالنے کا مفہوم کیا ہے؟ بعض کے نزدیک مجرمین کو دارالاسلام سے نکالنا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے وہاں سے مجرمین کو نکالنا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ اگر مجرم کو ارتکابِ جرم کے علاقے سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ وہاں کے لوگوں کو ستائے گا، اس لیے ایسے لوگوں کو قید خانہ میں بند کر دینا چاہیے۔ یہی اُن کا زمین سے نکالنا ہے۔ امام ابوحنیفہ رح نے اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے[1]۔

۲- (ا) اگر اس نے مال بقدرِ نصابِ سرقہ لیا ہو تو اس کا داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں دونوں کاٹ دیے جائیں گے[2] بشرطیکہ بایاں ہاتھ اور داہنا پاؤں سلامت ہوں۔ اگر یہ کٹے ہوئے یا ناکارہ ہوں تو قطع کی سزا ساقط ہوگی[3]۔ البتہ دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کے قطع کے لیے اُن کا کسی عیب سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے[4]۔ قطع کی ابتدا ہاتھ سے کی جائے گی اور اس کا خون بند کرنے کے بعد اس کا پاؤں کاٹا جائے گا۔ لیکن پاؤں کے قطع کے لیے ہاتھ کا زخم مندمل ہونے کا انتظار نہیں کیا جائے گا[5]۔

(ب) اگر اس نے مال بقدرِ نصابِ سرقہ لینے کے ساتھ مستغیث کو زخمی بھی کیا ہو تو ہاتھ اور پاؤں جانب مخالف سے قطع کیے جائیں گے اور زخموں کا خون بہا باطل ہوگا[6]۔ اس صورت میں بھی قطع کے لیے ہاتھ اور پاؤں کا سلامت رہنا ضروری ہے۔

۳- اگر مجرم نے قتل کیا ہو اور مال نہ لیا ہو تو قاتل کو بطورِ حد قتل کیا جائے گا۔ بشرطیکہ مقتول ایسا شخص ہو جس کا خون بہانا دائمی طور پر ممنوع ہو[7]۔

---

۱ ردالمحتار ص ۲۱۹ ج ۳ و معارف القرآن جلد ۳ — ۲ درمختار ص ۲۱۹ ج ۳

۳ بدائع الصنائع جلد ۷ مطبوعہ بیروت طبع ثانیہ ۱۳۹۴ھ و درمختار ص ۲۱۹ ج ۳ — ۴ ایضاً

۵ المغنی ص ۲۱۱ ج ۱۰ — ۶ درمختار ص ۲۲۰ ج ۳

۷ درمختار ص ۲۱۹ ج ۳

۴- (ا) اگر اس نے مال بقدر نصاب لینے کے ساتھ قتل بھی کیا ہو تو اس صورت میں قاضی کو اختیار ہے کہ وہ مندرجہ ذیل سزاؤں میں سے کوئی ایک جس کو وہ مناسب سمجھے مجرم پر نافذ کرے[1]

۱- ہاتھ اور پاؤں جانب مخالف سے قطع کرے اور پھر اس کو قتل کرے۔

۲- ہاتھ اور پاؤں جانب مخالف سے قطع کرے۔ پھر سولی دے۔

۳- ہاتھ اور پاؤں جانب مخالف سے قطع کرے، پھر قتل کرے اور پھر سولی دے۔ یعنی تینوں سزاؤں کو جمع کر دے۔

۴- پہلے قتل کرے اور پھر سولی دے۔

۵- صرف قتل کرے۔

۶- صرف سولی دے۔

(ب) اگر عورت بھی قطع الطریق کے جرم کی مرتکب ہو تو اس کو سولی کی سزا نہیں دی جائے گی۔ البتہ باقی سزائیں حسب جرم دی جائیں گی[2]

(ج) جانب مخالف سے کاٹنے کا مطلب داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا ہے۔

سولی کا طریقہ

تنبیہ۔ قتل اور سولی اگر دونوں کو جمع کیا جا رہا ہو تو ضروری ہوگا کہ پہلے قتل کیا جائے اور پھر سولی دی جائے۔ صرف سولی دینے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے۔

سولی دینے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے زمین میں ایک لکڑی گاڑ دی جائے۔ پھر نیچے ایک دوسری لکڑی عرضاً باندھ دی جائے جس پر مجرم دونوں پاؤں رکھے، پھر اس لکڑی کے اوپر تیسری لکڑی عرضاً باندھی جائے اور اس کے ساتھ مجرم کے ہاتھوں کو باندھ دیا جائے۔ پھر اس کی بائیں چھاتی پر برچھی مار کر اس کے پیٹ کو اندر سے خوب کاٹا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ پھر تین دن تک میت کو سولی پر لٹکتے رہنا دیا جائے۔ اس کے بعد ورثا اس کو لے جا کر دفن کر دیں۔ لیکن اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی[3]

[1] در مختار ص ۲۲۰ ج ۳ مطبوعہ مصر [2] در مختار ص ۲۲۱ ج ۳

[3] در مختار ص ۲۲۱ ج ۳

۵ ۔ اگر اس نے مال نصابِ سرقہ سے کم لیا ہو اور ساتھ قتل بھی کیا ہو تو مجرم کو بطور قصاص قتل کیا جائے گا۔[۱]

۶ ۔ اگر اس نے نہ مال لیا ہو اور نہ قتل کیا ہو بلکہ زخمی کیا ہو تو اس پر جراحات کا قانون نافذ ہو گا۔ یعنی اگر زخموں کا قصاص ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا، ورنہ دیت کی صورت میں دیت، اور حکومتِ عدل کی صورت میں حکومتِ عدل وصول کی جائے گی۔[۲]

دفعہ ۲۲ (ب) قطع الطریق کی پہلی چار سزاؤں میں اعانت کرنے والا اسی سزا کا مستحق ہو گا جس کا خود مرتکبِ فعل مستحق ہوتا ہے۔[۳]

مثلاً رہزنوں میں سے اگر ایک نے کسی کو قتل کیا تو اس کے بدلے میں اس پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا جو اس کے ساتھ ہو گی۔ اسی طرح اگر بعض نے مال لوٹا اور بعض نے قتل کیا تو ان سب کو قتل اور سولی دونوں سزائیں اگر حاکم مجاز چاہے تو دے سکتا ہے[۴] اور اگر بعض نے مال لوٹا ہو اور بعض نے کچھ نہ کیا ہو تو بھی سب کو بطورِ حد قطع کی سزا دی جائے گی۔[۵]

سزا قطع الطریق کے شواہد اور ائمہ اربعہ کا نقطۂ نظر

قطع الطریق کی پہلی چاروں سزاؤں کو بطورِ حد نافذ کیا جائے گا جن کی بنیاد قرآن حکیم کی اس آیت پر ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ	یہی سزا ہے ان کی جو لڑتے ہیں اللہ سے اور اس کے
وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ	رسول سے اور دوڑتے ہیں زمین میں فساد کرنے کو کہ
فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا	ان کو قتل کیا جائے یا وہ سولی چڑھائے جائیں یا کاٹے
اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ	جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے یا

[۱] درمختار ص ۲۲۰ ج ۳ [۲] درمختار ص ۲۲۱ ج ۳

[۳] درمختار ص ۲۲۰ ج ۳ مطبوعہ بولاق مصر نیز دیکھیے عالمگیری ص ۸۰ ج ۲ مطبوعہ نولکشور و المبسوط ص ۱۹۸ ج ۹

[۴] المغنی لابن قدامہ ص ۳۰۹ ج ۱۰ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ۔

[۵] التشریع الجنائی ص ۶۶۶ ج ۲

خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ج فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

دُور کر دیے جائیں زمین سے - یہ ان کی رسوائی ہے دُنیا میں اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے - مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

(مائدہ : ۳۳)

مذکورہ آیات میں لفظ "یحاربون" حرب سے ماخوذ ہے - اس کے اصل معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں اور محاورات میں یہ لفظ سلم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سلامتی کے ہیں - تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے اور ظاہر ہے کہ اکا دُکا چوری یا قتل وغارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا بلکہ یہ صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور غارت گری پر کمر بستہ ہو جائے - اسی لیے فقہاء نے اس سزا کا مستحق اُس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے، جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جا سکتا ہے - عام انفرادی جرائم کرنے والے چور اور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں[1]۔

آیت میں چار سزاؤں میں سے پہلی تین کو ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے جو باب تفعیل سے مبالغہ کے لیے آتے ہیں اور تکرار فعل اور شدت فعل پر دلالت کرتے ہیں - اور ان میں صیغہ جمع کا ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کا قتل یا سولی چڑھانا یا ہاتھ اور پاؤں کاٹنا عام سزاؤں کی طرح نہیں ہے کہ جس فرد پر یہ جرم ثابت ہو صرف اسی کو سزا دی جائے، بلکہ یہ جرم ڈاکوؤں کی جماعت میں سے ایک سے بھی صادر ہو گیا ہو تو پوری جماعت کو قتل یا سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دی جائے گی[2]۔ نیز اس طرز بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ قتل اور سولی وغیرہ قصاص کے طور پر نہیں

---

[1] تفسیر مظہری ص ۹۵ ج ۳ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی - [2] ردالمحتار ص ۲۲۰ ج ۳

کہ اولیاء مقتول کے معاف کرنے سے معاف ہو جائے۔ بلکہ اس میں شدت پیدا کی گئی ہے کہ یہ ایک شرعی حد ہے جو کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتی۔

رہزنی کی مذکورہ چاروں سزائیں حرف " اَوْ " کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں جو چند چیزوں میں سے کسی کا اختیار دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور تقسیم کار کے لیے بھی۔ اسی لیے صحابہؓ اور تابعین کی ایک جماعت حرف "اَو" کو اختیار دینے کے معنی میں لے کر اس طرف گئی ہے کہ ان چاروں میں امام کو اختیار ہے کہ وہ ڈاکوؤں کی قوت و شوکت اور جرائم کی شدت و خفت پر نظر کر کے ان کے حسب حال یہ چاروں سزائیں یا ان میں سے کوئی ایک جاری کرے۔ سعید بن مسیبؒ، عطاءؒ، داؤدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، نخعیؒ، مجاہدؒ، اور ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اور ایک جماعتِ صحابہ و تابعین نے حرف " اَوْ " کو اس جگہ تقسیم کے معنی میں لے کر آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ رہزنوں اور رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بردہ اسلمی سے صلح کا معاہدہ فرمایا تھا۔ مگر اس نے عہد شکنی کی اور کچھ لوگ جو مسلمان ہونے کے لیے مدینہ طیبہ آ رہے تھے ان پر ڈاکہ ڈالا۔ اس واقعہ پر جبریل امین جو حکم سزا لے کر نازل ہوئے اس کا مطلب یہ تھا کہ

" جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا ہو اور اس کا مال بھی لوٹا ہو تو اُسے قتل کیا جائے اور سُولی چڑھایا جائے۔ اور جس نے صرف قتل کیا ہو اور مال نہ لوٹا ہو اس کو قتل کیا جائے۔ اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیے جائیں۔ اور جو اُن میں سے مسلمان ہو جائے اُس کا جرم معاف کر دیا جائے اور جس نے قتل و غارت گری کچھ نہیں کی صرف لوگوں کو ڈرایا ہے اس کو جلا وطن کر دیا جائے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نوعیت کا جرم ہوگا اسی نوعیت کی سزا بھی دی جائے گی۔ نہ چاروں سزائیں اکٹھی دی جا سکتی ہیں اور نہ بغیر کسی امتیاز کے کوئی سی ایک سزا دی جا سکتی ہے، جیسا کہ امام مالکؒ کا مذہب ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ وغیرہ حضرات کا یہی مسلک ہے کہ اگر قطع الطریق کا جرم کرنے والوں نے قتل کیا ہو

[1] بحوالہ تفسیر مظہری ص ۱۰۱ ج ۳ ۔ مائدہ

اور مال نہ لیا ہو تو اس کی سزا اَنْ یُّقَتَّلُوْا ہے۔ یعنی ان سب کو قتل کیا جائے گا۔ اور قتل کے ساتھ اگر مال بھی لوٹا ہو تو قتل اور سولی دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ اور اگر انہوں نے مال لوٹا ہو مگر قتل نہ کیا ہو تو ان کی سزا اَنْ تُقَطَّعَ ایدیھم وارجلھم من خلاف ہے۔ یعنی ان کے داہنے ہاتھ گٹوں پر سے اور بائیں پاؤں کے ٹخنے پر سے کاٹ دیے جائیں اور اگر انہوں نے ڈرایا دھمکایا ہو تو ان کی سزا اَوْ ینفوا من الارض ہے۔ یعنی اُن کو قید کر دیا جائے[1]

ایک شبہ کا ازالہ بعض حضرات نے اس آیت کو مرتدین کے ساتھ خاص کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ کرنے کا ذکر ہے اور محاربہ کرنے سے آدمی مرتد ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اس آیت کا تعلق قوم عُرَیْنَہ سے ہے۔ اور وہ مرتد ہو گئے تھے۔

قوم عرینہ کا واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی بیماری کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم ہمارے اونٹوں کے پاس جاؤ۔ اور اُن کا دودھ اور پیشاب پیو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور وہ صحت مند ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مرتد ہو گئے اور انہوں نے اونٹوں کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب اس واقعہ کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا جو اُن کو پائے تو اُن کے ہاتھ اور پاؤں کو کاٹ دے اور اُن کی آنکھیں نکال کر ان کو دھوپ میں پھینکا جائے۔ یہاں تک کہ وہیں مرجائیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آیت کو مرتدین کے بارے میں خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ عام ہے اس میں مسلمان قُطَّاعُ الطریق بھی شامل ہیں۔ بلکہ ابن عباس اور جمہور کا مسلک تو یہی ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول مسلمان رہزنوں کے بارے میں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالک سب حضرات کا یہی مسلک ہے۔ اور یہ کہنا کہ "آیت میں محاربہ یعنی مقابلہ کرنے کا ذکر ہے جو ارتداد کو مستلزم ہے"، صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ محاربے کا اطلاق مسلمانوں پر بھی ہوا ہے اور اس لفظ سے ان کی عظیم نافرمانی کا احساس دلانا مقصود ہے۔ مثلاً سعد بن قیس سے روایت ہے کہ حارثہ بن بدر نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول سے محاربہ کیا اور

---

[1] احکام القرآن للجصاص ص ۴۰۸ ج ۲ بیروت۔

وہ زمین میں بدامنی پھیلاتا پھرتا تھا، مگر قبل اس کے کہ اُس کو گرفتار کیا جاتا، اس نے توبہ کر لی۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصرہ کے گورنر کو لکھا کہ "حارثہ بن بدر نے اللہ اور اُس کے رسول سے محاربہ کیا تھا مگر اس نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی ہے، لہٰذا آپ اس کے ساتھ بھلائی کے سوا اور کوئی معاملہ نہ کریں"۔ اس حدیث میں حارثہ بن بدر پر لفظ "محاربہ" کا اطلاق ہوا ہے، حالانکہ وہ مرتد نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ انہوں نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی تھی جس سے معلوم ہوا کہ اگر وہ گرفتاری کے بعد توبہ کرتے تو اُن سے دنیاوی سزا ساقط نہ ہوتی۔ اور اگر وہ مرتد ہو چکے ہوتے تو توبہ سے ہر حالت میں حد ساقط ہوتی۔ خواہ وہ گرفتاری سے قبل توبہ کرتے یا بعد۔ اس مخصوص واقعہ کے علاوہ خود آیت "الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیہم" سے جو استثنا کیا گیا ہے وہ اس مدعا پر اور زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اس استثنا میں قبل از گرفتاری توبہ کرنے سے حد کو ساقط کرنا بیان کیا گیا ہے۔ اگر وہ مرتد ہوتے تو جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ توبہ سے ہر حالت میں حد ساقط ہو جاتی ہے خواہ توبہ گرفتاری سے قبل ہو یا بعد۔ حالانکہ یہاں گرفتاری کے بعد توبہ کرنے سے حد ساقط نہیں ہوتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس آیت کا تعلق مرتدین سے نہیں ہے بلکہ قُطّاعُ الطریق سے ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا ذمی۔ نیز یہاں آیت میں سزا ہاتھ اور پاؤں کاٹنا بھی بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ سزا مرتد کی نہیں ہے۔ اس لیے اس کی سزا تو قتل ہے۔ اور یہ کہنا کہ یہ آیت عُرَینوں کے واقعہ میں نازل ہوئی تھی، یقینی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے تو بلاشبہ اسی طرح مروی ہے۔ مگر اس کے سبب نزول میں کافی اختلاف ہے۔ حضرت کلبی نے ابن عباس کے ذریعہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ یہ آیت ابوبرزہ اسلمی کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے ایسے لوگوں پر ڈاکہ ڈالا تھا جو اسلام لانے کے ارادے سے آئے تھے۔ اسی طرح حضرت عِکْرِمَہ نے بھی ابن عباس رض کے واسطے سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر اس روایت میں قوم عُرَینَہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت عُرَینین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر اس روایت میں انہوں نے ارتداد کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حضرت قتادہ رض ابن سیرین رض کے حوالہ سے یہ فرماتے ہیں کہ عُرَینین کا واقعہ حدود کے نزول سے پہلے کا ہے اس لیے کہ عُرَینین کی آنکھیں نکال کر اُن کا مُثلہ کیا گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں مثلہ کرنے کے حکم کو منسوخ فرما دیا تھا۔ اگر آیت مذکورہ کا تعلق عُرَینین کے واقعہ سے ہوتا تو اس میں آنکھوں کے نکالنے کا بھی حکم ہوتا، حالانکہ اس کا ذکر آیت میں نہیں

ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرنیین کا واقعہ آیت کے نزول سے قبل کا ہے۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ اس واقعہ کا تعلق عرنیین سے ہے تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ آیت مرتدین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ انہی کے ساتھ خاص ہے بلکہ یہ عام ہے جو تمام محاربین کو شامل ہے[1]۔

فصل چہارم

جرم قطع الطریق کے ثبوت کے بعد اس کے ساقط ہونے کے اسباب

دفعہ ۲۵ | مندرجہ ذیل امور میں سے اگر کوئی امر پایا جائے تو حد قطع الطریق ساقط ہوگی[2]۔

۱۔ مجرم گرفتاری سے قبل رہزنی سے توبہ کرے۔

۲۔ مستغیث یہ کہہ دے کہ ملزم کا اقرار جھوٹا ہے۔

۳۔ اقرار جرم کرنے والا اپنے اقرار سے رجوع کرے۔

۴۔ مستغیث گواہوں کو جھوٹا قرار دے۔

۵۔ ملزم مال کا مالک بن جائے۔

حد کے سقوط کے بعد دفعہ ۲۵ پر عمل ہوگا۔

تشریح:۔ ملکیت کے بارے میں اس تشریح کا اعتبار کیا جائے گا جس کا ذکر دفعہ ۱۲ کی تشریح ۲ میں گذر چکا ہے[3]۔

فصل پنجم

(حد قطع الطریق کے ساقط ہونے کے بعد سزا، تاوان اور عدم تاوان کے بیان میں)

دفعہ ۲۵ | (ا) اگر حد اس لیے ساقط ہوئی ہو کہ مجرمین نے گرفتاری سے قبل توبہ کرلی تھی تو اس صورت میں تفصیل

---

[1] تمام بحث دیکھیے احکام القرآن للجصاص الحنفی ص ۴۰۶ تا ۴۰۸ ج ۲ مطبوعہ بیروت۔

[2] بدائع الصنائع ص ۹۶ ج ۷۔ [3] ایضاً

ذیل عمل کیا جائے گا۔

۱۔ اگر انہوں نے صرف مال لیا ہو اور دیگر کوئی جرم نہ کیا ہو تو اس صورت میں اگر مال ان کے پاس موجود ہو تو مستغیث کو واپس کیا جائے گا۔ اور اگر ضائع ہو گیا ہو یا انہوں نے ضائع کر دیا ہو تو اُن سے تاوان وصول کر کے مستغیث کو دیا جائے گا[۱]۔

۲۔ اگر انہوں نے صرف قتل کیا ہو تو اُن میں سے جس نے قتل کیا ہو اس کے بارے میں دیکھا جائے گا کہ اگر یہ قتل اس نے آلۂ جارح یعنی لوہے کے ہتھیار سے کیا ہو تو مقتول کے ورثا کو اختیار ہو گا کہ قصاص کا مطالبہ کر کے اس کو قتل کرائیں یا اس کو معاف کر دیں۔ اگر اس نے یہ قتل لاٹھی یا پتھر کے ذریعے کیا ہو تو قاتل کی عاقلہ پر دیت عائد ہو گی جو وصول کر کے مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی[۲]۔

۳۔ اگر انہوں نے مال بھی لیا ہو اور قتل بھی کیا ہو تو دونوں جرائم کے جمع ہونے کی صورت میں وہی حکم عائد کیا جائے گا جو الگ الگ کرنے کی صورت میں عائد ہوتا ہے[۳]۔

۴۔ اگر انہوں نے مال بھی لیا ہو اور زخمی بھی کیا ہو، یا مال لینے کے ساتھ قتل اور زخم لگانے کا جرم بھی کیا ہو، یا زخمی کیا ہو لیکن نہ مال لیا ہو اور نہ قتل کیا ہو، تو ان صورتوں میں قتل اور مال کے بارے میں مذکورہ شق ۱ و ۲ کی تفصیل کے مطابق سزا دی جائے گی۔ اور زخموں کے بدلے میں اگر قصاص ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت کی صورت میں دیت اور حکومتِ عدل کی صورت میں حکومتِ عدل واجب ہو گی[۴]۔

۵۔ اگر مجرمین نے نہ قتل کیا ہو اور نہ مال لیا ہو البتہ زخم پہنچا کر ڈرایا ہو تو اس صورت میں اگر قصاص ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت کی صورت میں دیت اور حکومتِ عدل کی صورت میں حکومتِ عدل واجب ہو گی اور ان کو تعزیری سزا کے طور پر قید کیا جائے گا[۵]۔

دفعہ ۲۵ (ب) اگر حد اس لیے ساقط ہوئی ہو کہ اقراری ملزم نے اقرار سے رجوع کر لیا تھا تو مُقِر کا یہ رجوع مال اور قصاص کے حق میں معتبر نہ ہو گا[۶]۔

(ج) اگر حد اس لیے ساقط ہوئی ہو کہ مستغیث نے گواہوں کو یا مُقِر کے اقرار کو جھوٹا قرار دے دیا تھا تو ایسی صورت میں ملزموں کو بری کیا جائے گا۔ اور اُن پر کوئی چیز عائد نہ ہو گی[۷]۔

---

[۱] بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۲، ۹۳ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] ایضاً [۷] ایضاً ص ۹۷

(د) اگر حد اس لیے ساقط ہوئی ہو کہ رہزنوں کے اندر نابالغ یا مجنون شامل تھا تو دیکھا جائے گا کہ رہزنوں میں سے آیا قتل کا فعل آلہ جارحہ کے ساتھ عاقل اور بالغ سے صادر ہوا ہے یا نابالغ یا مجنون سے؟ پہلی صورت میں مقتول کے ورثاء کو قصاص لینے یا معاف کرنے کا اختیار ہوگا۔ اور دوسری صورت میں جرم خواہ آلۂ جارحہ کے ساتھ ہو یا بغیر آلۂ جارحہ کے، اس کی عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔ اور اگر نابالغ یا مجنون نے مال لیا ہو تو وہ مال ادا کرنے کے ضامن ہوں گے۔[1]

(ہ) مال کی ادائیگی کی صورت میں اگر مال موجود ہو تو وہ بعینہٖ مستغیث کو واپس کیا جائے گا۔ خواہ وہ رہزنوں کے قبضہ سے ملے یا کسی اور کے قبضہ سے۔ اور اگر مال میں کوئی تغیر پیدا ہو چکا ہو تو اس کا حکم وہی ہوگا[2] جو دفعہ ۱۸۱ میں گذر چکا ہے۔

<u>حد کے سقوط کے بعد قصاص اور مال کا مطالبہ معین سے نہ ہوگا۔</u>

(و) حد کے ساقط ہونے کے بعد قصاص اور مال کی ادائیگی کا مطالبہ صرف جرم کے مرتکب سے ہوگا۔ اس کے مددگار (اعانت جرم کرنے والے) سے نہ ہوگا۔ اس کا اعتبار جس طرح حدِ قطع الطریق کے ساقط ہونے کے بعد کیا جائے گا۔ اسی طرح حد سرقہ کے ساقط ہونے کے بعد بھی کیا جائے گا۔[3]

---

[1] بدائع الصنائع ص ۹۷ ج ۷ [2] ایضاً

[3] المبسوط للسرخسی ص ۱۹۹ ج ۹ والمغنی والشرح الکبیر ص ۳۲۰ ج ۱۰

اولاد اور والدین کے باہمی حقوق

ڈاکٹر احمد عمر ہاشم

قرآن کریم اور سنت نبوی کے مطالعہ سے ہمیں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بچوں کی صحیح تربیت و تعلیم اور انہیں انسانی معاشرے کا صالح عنصر بنانے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اسلام اولاد کو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت قرار دیتا ہے۔ اس نعمت کی تمنا اور خواہش صرف عام انسانوں کو ہی نہیں ہوتی بلکہ انبیاء علیہم السلام بھی اس کی تمنا کرتے رہے ہے۔ اور اس کے حصول کے لیے اپنے رب سے دعا کرتے رہے۔ مگر وہ ایسی اولاد کے طالب رہے جو والدین کے لیے فتنہ بننے کے بجائے اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور دنیا کے اندر بدی اور شر میں اضافہ کرنے کے بجائے نیکی اور خیر کے پلڑے میں اپنا بوجھ ڈالنے والی ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ "عباد الرحمٰن" (رحمان کے بندوں) کی صفات بیان کرتے ہوئے آخر میں فرماتا ہے کہ وہ اپنے رب سے اولاد کی درخواست اس انداز میں کرتے ہیں:

ربنا هب لنا من ازواجنا وذريتنا قرة اعين واجعلنا للمتقين اماما (سورة الفرقان)

اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر۔ اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا کہ:

هنالك دعا زكريا ربه قال رب هب لى من لدنك ذرية طيبة انك سميع الدعاء (آل عمران)

وہاں زکریا نے اپنے رب کو پکارا: اے میرے پروردگار اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر۔ تو ہی دعا سننے والا ہے۔

اس طرح اسلام اولاد کو بلاشبہ ایک عظیم نعمت اور فطری آرزو قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی اولاد کی ہر گونہ

حفاظت اور تربیت کا حکم دیتا ہے۔ قرآن کریم نے جاہلی دور کے لوگوں کے اس فعل پر سخت تنقید کی کہ بھوک کے خوف سے بچوں کو مار ڈالتے تھے، یا عار اور جھوٹی شرم کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "لا تقتلوا اولادکم من املاق - نحن نرزقکم و ایاھم" (اپنی اولاد کو غربت میں گھر جانے کی وجہ سے قتل نہ کرو - ہم تمہارے لیے بھی اور ان کے لیے بھی رزق فراہم کرتے ہیں) سورۂ بنی اسرائیل میں فقر و فاقہ کے محض اندیشے کی بنا پر قتلِ اولاد کی ممانعت فرمائی۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ کونسا گناہ سب سے زیادہ بڑا ہے"۔ آپ نے فرمایا: تو کسی کو اللہ کا شریک ٹھیرائے۔ درآں حالانکہ اللہ تعالیٰ تجھے پیدا کرنے والا ہے۔ میں نے عرض کیا: "اس کے بعد کونسا گناہ بڑا شمار ہوتا ہے؟" آپ نے فرمایا! "تو اپنے بچے کو اس خوف سے مار ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا"۔ پھر میں نے عرض کیا: "اس کے بعد کونسا گناہ عظیم تر ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "تیرا اپنے ہمسائے کی بیوی سے ناجائز تعلق قائم کرنا"

یہ بات محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ اسلام اوائل عمر ہی سے بچوں کو اسلامی امور سکھانے کی تاکید کرتا ہے۔ تاکہ وہ جب بڑے اور باشعور ہو جائیں تو ان کے دلوں میں خدا کا خوف جاگزین ہو چکا ہو، اور وہ اپنے رب کی عبادت اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذوق و شوق دل میں رکھتے ہوں۔ اسی بنا پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشہور ارشاد مبارک ہے کہ:

مُروا اولادکم بالصلاۃ وھم	اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دو جب کہ وہ سات
ابناء سبع سنین، واضربوھم	سال کے ہو جاویں، اور نماز کی خاطر انہیں مارو جب
علیھا وھم ابناء عشر سنین۔ و	وہ دس سال کے ہو جاویں۔ اور اس عمر میں ان کے
فرقوا بینھم فی المضاجع (امام احمد)	بستر بھی الگ کر دو۔

باپ اگر اپنے بچے کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ بچے کے اندر اللہ کی خشیت اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ صالح زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے تو باپ کی یہ نیکی اجر و ثواب کے لحاظ سے دائمی نیکی بن جاتی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائمی نیکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

اذا مات الانسان انقطع عملہ	جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع

إلا من ثلاث: صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له
ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے تین عمل باقی رہتے ہیں، صدقہ جاریہ، یا وہ علم جس سے استفادہ کیا جا رہا ہو، یا نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کرتی ہو۔

جوانی کے زمانے میں جو لڑکے اچھے کام کرتے ہیں اور جن انسانی خوبیوں سے اپنی جوانی کو آراستہ کرتے ہیں دنیا کے اندر بھی وہ اُن کے اچھے نتائج سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ جوانی کے زمانے میں جو نوجوان جیسا رویہ اختیار کرے گا پیری میں اس کے ساتھ وہی برتاؤ دوسرے کریں گے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ما أكرم شاب شيخاً لسنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه (ترمذی)
جو نوجوان کسی بوڑھے کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے عزت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس نوجوان کے لیے بھی کسی کو مقرر کر دیتا ہے جو اس کی اس وقت عزت کرے گا جب وہ سن رسیدہ ہو جائے گا۔

سب سے اہم بات جسے اسلام کم عمری کے اندر بچوں میں پیدا کرنے پر زور دیتا ہے وہ راست گوئی ہے۔ یہ بڑی ناگزیر بات ہے کہ بچے سچ بولنے کی تربیت پائیں۔ اور اپنے گھر کے اندر، خاندان کے اندر اور دوستوں کے اندر راست گوئی کا چرچا دیکھیں۔ اس بارے میں اگر بچے اپنے سامنے اچھا نمونہ نہ پائیں گے تو راست گوئی کے عادی نہ بن سکیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ "ایک روز میری ماں نے مجھے بلایا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پاس تشریف فرما تھے۔ میری ماں نے مجھے کہا: آؤ تجھے کچھ دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر دریافت فرمایا: تم اسے کیا دینا چاہتی ہو؟ میری ماں نے جواب دیا کہ میں اسے ایک کھجور دینا چاہتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تم اسے یونہی بہلانا چاہتیں اور کچھ نہ دیتیں تو تمہارے اوپر ایک جھوٹ کا گناہ لکھ دیا جاتا۔ (ابوداؤد)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ نے فرمایا: الزموا أولادكم وأحسنوا أدبهم (اپنی اولاد کی طرف متوجہ رہو اور انہیں اچھا ادب سکھاؤ)۔

اولاد سے محبت اور رحمدلی عین تقاضائے اسلام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تربیت و تادیب اور محبت و رحمدلی کے دونوں پہلو متوازن رہیں۔ ترغیب و ترہیب اور محبت و تادیب دونوں کے اثرات الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور متوازن اور صحت مندانہ تربیت کے لیے دونوں پہلوؤں کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو بوسہ دیا۔ اقرع بن حابس نے یہ دیکھ کر کہا: میرے دس بچے ہیں مگر میں نے ان میں سے کسی کو آج تک بوسہ نہیں دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من لا یرحم لا یرحم (جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا)۔

بچوں کے اندر جرأت وشجاعت اور مردانگی کی روح پھونکنی چاہیے اور جھوٹے قصے کہانیوں اور خرافات سے اُن کے ذہن مسموم نہ کیے جائیں۔ اور نہ انہیں ایسی داستانیں پڑھنے کا موقع دیا جائے جو انہیں زندگی سے متنفر کردیں۔ اُوپر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا جاچکا ہے کہ "بچوں پر پوری توجہ رکھنی چاہیے"۔ لہٰذا انہیں نوکروں چاکروں اور تربیت بچگان کے اداروں کے سپرد کرنے پر اکتفا نہ کی جائے۔ بچے اکثر برائیاں نوکروں چاکروں سے سیکھتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ صورت حال اندوہناک حادثات پر منتج ہوجاتی ہے۔

بچیوں کے بارے میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی تعلیمات ملتی ہیں۔ ایک بچی کی صحیح تربیت سے ایک پاکیزہ خاندان کی داغ بیل پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

ما من احد یدرک ابنتین فیحسن	جس شخص کی دو بچیاں ہوں اور جب تک وہ اس کے
الیہما ما صحبتاہ الا ادخلتاہ	پاس رہیں اُن سے حسن سلوک کرتا رہے تو وہ اسے
الجنۃ — وفی روایۃ اخری	جنت میں داخل کرادیں گی۔ (دوسری روایت میں ہے کہ)
من کانت لہ ابنتان او اختان۔	دو بچیاں ہوں یا دو بہنیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، ایک مسکین عورت اپنی دو بچیوں کو ساتھ لیے میرے پاس آئی۔ میں نے اُسے تین کھجوریں دیں۔ اُس نے دونوں کو ایک ایک کھجور دے دی۔ اور ایک کھجور اپنے منہ میں ڈالنے لگی تو بچیوں نے وہ بھی اس سے مانگ لی۔ اُس نے کھجور کے دو حصے کیے۔ اور آدھی آدھی دونوں کو دے دی۔ اور خود نہ کھائی۔ مجھے عورت کی یہ خصلت بہت پسند آئی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ان اللہ اوجب لہا بہا الجنۃ او اعتقہا بہا من النار (مسلم)۔ اس ایک کھجور کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اُس عورت کے لیے جنت لازم کردی یا اُسے دوزخ سے رہائی دے دی۔

(باقی آئندہ)

(بقیہ اشارات) اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔ تبریک و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں، مگر فوج کی نئی حکومت جس پر اُن کے اندازوں سے زیادہ بھاری بوجھ آپڑا تھا اور جسے سیاسی معاملات، انتظامی پیچیدگیوں اور عوامی مسائل کا کوئی عملی تجربہ پہلے سے نہ تھا، اس کے ساتھ اکابرِ دین و سیاست نے پہلے متذبذبانہ اور پھر محتاط طرزِ عمل اختیار کیا، اور مزید آگے چلنے کے بعد اپنے آپ کو حکومت سے ایک مناسب فاصلے پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگر محبتِ دین و وطن پر مبنی بصیرت پوری طرح کام کر رہی ہوتی تو یہ لوگ سوچتے کہ اگر ۵ جولائی سے پہلے والے حالات ہی آگے چلتے اور انہی کے تحت انتخابات ہونے تو ہزار سمجھوتوں کے باوجود کیا نتائج برآمد ہوتے؟ اور جو نتائج برآمد ہوتے اُن کے زیرِ اثر پاکستان میں ملک و دین کا مقدر کیا ہوتا، سیاسی اختلافات کرنے والوں کو فسطائیت کا چوٹ کھایا ہوا اژدر کس سلوک سے نوازتا۔ اور اسی طرح کاش کہ یہ حضرات یہ بھی سوچتے کہ اگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو موجودہ قوت کے بجائے کسی اور نقطۂ نظر کے لوگ غالب آئے ہوتے تو آج حالات کیا ہوتے، خود ان لیڈروں کو کیا تجربات پیش آتے۔ حکومت کی انتظامی عملداری کیا شکل اختیار کرتی، اور ایسے کسی گروپ کے اہتمام سے ہونے والے انتخابات کا رُخ کیا ہوتا۔ اور اب اگر آپ بے نیازی اور بے تعلقی کی روش اختیار کر کے موجودہ حکومت کو اندرونی تخریبی عناصر اور بیرونی سازشی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پیچیدگی و ژولیدگی کے اس مرحلے تک پہنچا دیں جس پر پہنچ کر مرحوم صدر ایوب اور بعد میں صدر یحیٰی نے محل سے بھاگتے بھاگتے اقتدار کا تاج کسی بھی جھولی میں جلد سے جلد پھینک دیا، اور ملک کو تقدیر کے حوالے کر دیا گیا تو پھر آپ کی کوتاہی کا کفارہ کیسے ادا ہو گا؟

بدقسمتی سے جس اعلیٰ درجے کی بصیرت مندی اور اس کے تحت جس ایثارِ مفاد و تشخص کی ضرورت تھی۔ اس کی کوتاہی کی حد یہ سامنے آئی کہ حکومت سے تعاون کرنے کا معاملہ تو الگ رہا، جو رہنمایانِ قوم ملک کے

(بقیہ حاشیہ) انتخابات ہوتے ہیں اور نہ سارے فیصلوں اور ان کے نتائج میں جمہوری روح کا مظاہرہ ہوتا ہے، کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کوئی صاحب جمہوریت کا ورد کرتے کرتے جب کرسیٔ اقتدار تک پہنچ جاتے ہیں تو [illegible] کے شیدائی ثابت ہوتے ہیں۔

کام کر رہے تھے خود وہ اپنے ہی باہمی اتحاد کو جاری نہ رکھ سکے۔ جب تک اتحاد کا ظاہری ڈھانچہ برقرار تھا تو بیانوں اور مطلبوں کی رنگا رنگی اضطراب پھیلاتی رہی۔ بعد ازاں سیٹوں کی خیالی بساط پر ایک دوسرے سے داؤں جیتنے کی مہم شروع ہو گئی، پھر ذرا اور آگے چل کر فرقہ وارانہ تعصبات نے بھی اپنے کرشمے دکھائے۔ اس طرح مشکل سے بہم شدہ آپ کی جوہری قوت عمل تابکاری میں بکھرنے لگی جس کے دوران میں پہلے ایک گروہ الگ ہوا۔ پھر ایک اور گروہ نے الگ ہونے کے لیے داؤں پیچ لڑانے شروع کر دیے۔ اس طرح قوم کے لیے نو جماعتوں کے اتحاد نے جو مرکزِ اُمید پیدا کیا تھا، وہ متزلزل ہو گیا۔

سوچنے کا بڑا معاملہ یہی تھا کہ قوم کو عرصے سے کوئی مضبوط اور غیر مصنوعی اور غیر ڈرامائی قیادت نہیں ملی، اور آج تک کوئی ایک پارٹی یہاں ایسی موجود نہیں ہے جو تن تنہا برسرِ اقتدار آئے، اور آ ہی جائے تو مسائلستان کے خارزار میں سے تن تنہا بخیریت گذر سکے، ایسی مصیبت کی ماری قوم کے سامنے جب قومی اتحاد رُونما ہوا تو یہ دیرینہ مایوسی، جو کبھی اسے غیر موزوں قوتوں کی بیعت کر لینے پر مجبور کر دیتی تھی، کبھی اُسے جمود یا اضطراب میں مبتلا کر دیتی تھی، پہلی مرتبہ اُمید سے بدل گئی۔ لوگوں کی اکثریت نے بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو قومی اتحاد سے وابستہ کیا۔ اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اس متحدہ قیادت کے ایک اشارے پر وہ لاٹھیاں گولیاں کھانے اور جان و مال کا ایثار کرنے پر تیار ہو گئے۔ ہماری سیاسی کہانی جب اس کلائمکس تک پہنچی اور اس کا میڈین نتیجہ نکلنے کا واضح اشارہ پیدا ہو گیا تو کہانی کا ہیرو بننے والی اجتماعی قیادت اسٹیج چھوڑ کر پردے کے پیچھے چلی گئی اور اُن کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تماشائی حیران کہ پردے کے آگے کا اصل ڈرامہ تکمیل سے پہلے ہی ختم ہو گیا، اور پردے کے پیچھے ایک کربناک ڈرامے کا آغاز ہو گیا۔

کیا کسی لیڈر نے یہ سوچا کہ کیا مقام حاصل ہوا تھا اور اسے کس سرسری انداز سے کھو دیا گیا ہے۔ لیڈر اور پارٹیاں برسوں کی تگ و تاز سے اس مرتبے پر پہنچتی ہیں کہ ان کی پکار پر قوم متحرک ہو سکے۔ یہ مقام تمام عہدوں اور نشستوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہ مقام آپ کو حاصل ہوا اور آپ نے اس کا حق ادا کرنے کے بجائے، اسے بالکل طفلانہ طریق سے کھو دیا۔ ہر کسی نے نہایت بچگانہ انداز سے

اُمیدیں یہ لگالیں کہ عوامی حمایت وتائید کی جو شاندار فصل لہلہا رہی ہے، اُسے وہ تنہا کیوں نہ کاٹ لے جائیے۔ ایسے خواب دیکھنے والوں کے سامنے جب اُلٹی تعبیر آئے گی، تب انہیں سیاست کا وہ سبق ملے گا جو ایک بصیرت مند لیڈر تاریخ اور سماجی علوم اور عوامی نفسیات کی روشنی میں سیاست کاری کا آغاز کرنے سے پہلے جانتا ہے۔

مقصودِ گذارش نہ گستاخی ہے نہ تحقیر! اپنی شدتِ احساس کے زیرِ اثر یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ ابھی تلافیٔ مافات کا کچھ موقع باقی ہے۔ موقع یہی ہے کہ آپس میں اتحاد اور تعاون کی راہیں نکالی جائیں۔ سیاست کاری کا ایک یہی راستہ نہیں ہے کہ جو بھی حکومت ہو، آپ اپوزیشن کے محاذ پہ رہ کر دُور ہی دُور سے اس کا تماشا کرتے رہیں اور اسے چلانے والوں کو یا عوام کو جو مشکلات اور پیچیدگیاں پیش آئیں، ان کے گراف بنا بنا کر اندازہ کیا جائے کہ کب کھیل ختم ہوتا ہے اور کب میدان ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ کیا یہ صورتِ حالات آپ کے سامنے واضح نہیں کہ سماج دشمن اور تخریبی عناصر بار بار امن وامان کو تہ و بالا کرتے اور قومی املاک کو برباد کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ باہر سے کس طرح رخنہ اندازیاں ہو رہی ہیں؟ کیا آپ پر روشن نہیں ہے کہ کمیونسٹ عنصر کی جبلت پھرت بڑھ گئی ہے اور اُن کی کلیدی شخصیتیں ایک طرف زیرِ زمین سازباز کر رہی ہیں اور دوسری طرف بالائے سطح مختلف راستوں سے اپنے ہاتھ دکھا رہی ہیں؟ اس وقت اگر آپ سب مل جل کر اسلامی نظام کی آمد کا (اور ضمناً جمہوریت کا) راستہ تیار نہیں کر لیتے تو خدا نہ کرے، اس کوتاہی کا حساب چکانے کے لیے مشیتِ الٰہیہ ایک سوشلسٹ انقلاب کا بل ڈوزر بھی آپ کے سروں پہ سے گزار سکتی ہے۔

یہ تو آپ کی اور ملک کی خوش قسمتی ہے کہ قبل اس کے کہ اسلامی سوشلزم کا انجن سائنٹیفک سوشلزم کی گاڑی کو کھینچ کے آگے لے آتا، ایک ایسی قوت میدان میں آگئی جو نہ صرف نیت کے لحاظ سے اسلام کا غلبہ چاہتی ہے۔ بلکہ عملاً بھی امکانی تدبیریں کر رہی ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ضرور ہے، مگر وہ اس قسم کا موقع فوراً ہی دوبارہ فراہم نہیں کر سکتی۔ وہ اگر کرے بھی تو ایک لمبے عرصے تک پہلے یہ سبق پڑھائے گی کہ اس طرح کا موقع پیدا ہو تو کسی قوم کے رہنماؤں کو کیا کرنا چاہیے۔ اب اگر اس موقع کو ضائع کرنے ہی پہ آپ تُلے ہوئے ہوں تو اس اندیشے کو ضرور سامنے رکھیں کہ اگر اسلام کے لیے کچھ

کرنے کی موجودہ کوشش ناکام ہوگئی تو پھر قانون کے ردِّعمل کے تحت کوئی نہ کوئی مخالفِ اسلام قوت بھرپور جذبۂ انتقام کے ساتھ اُبھرے گی۔ اُس وقت اگر آپ دوڑے دوڑے اتحاد کی پناہ گاہ بنانا بھی چاہیں گے تو نہ بنا سکیں گے۔

براہِ کرم تاریخ کی جبین کی سلوٹوں کو دیکھیے کہ وہ کن امکانات کی نشاندہی کرتی ہیں۔
